MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میرتقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اسکول آف ہیومنٹیز

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

Vol-1

جلد اول

تعلیم انسان کو بے جا پابندیوں سے آزاد کرتی ہے اور آج کے عہد میں یہ جمہوریت کے احساس کی بنیاد ہے۔ تعلیم نسل اور دیگر حالات سے پنپنے والی ذات، برادری اور دوسری طبقاتی تفریق کو ختم کر کے انسان کو ایسی تمام برائیوں سے اوپر اٹھاتی ہے۔

اندرا گاندھی

"Education is a liberating force, and in our age it is also a democratising force, cutting across the barriers of caste and class, smoothing out inequalities imposed by birth and other circumstances."

- Indira Gandhi

MUD-010
Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib
میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S UNIVERSITY
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

جلد اول

بلاک 1
میر تقی میرؔ: حیات وشخصیت 9

بلاک 2
میر تقی میرؔ: فکروفن (اول) 89

بلاک 3
میر تقی میرؔ: فکروفن (دوم) 175

EXPERT COMMITTEE

Professor Malati Mathur
Director, School of Humanities
IGNOU, New Delhi.

Professor Mohd. Shahid Husain
Shahjahanabad Apartments
Sector -11, Dwarka, New Delhi

Professor Mohammad Faruq Ansari
NCERT, New Delhi.

Professor S.M. Anwar Alam
New Delhi. Centre of Indian Languages, JNU,

COURSE COORDINATOR

Dr. Shakir Ali Siddiqui, Assistant Professor, Discipline of Urdu, School of Humanities, IGNOU, New Delhi

Editor: Prof. Wahajuddin Alvi, Former Dean, Faculty of Humanities and Languages & Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

COURSE PREPARATION

Writers	Units
Dr. Imtiyaz Ahmad Tantray, Assistant Professor, Govt. Degree College, Shopian, Higher Education Department Govt. of J&K	1, 2& 3
Prof. Ghazanfar Ali, Former Director, Academy of Professional Development of Urdu Medium Teachers (APDUMT), Jamia Millia Islamia, New Dehli, Delhi	4
Dr. Fakhre Alam, Assistant Professor, Department of Urdu, MJK College, Bettiah, West Champaran, Bihar	5
Dr. Mohd. Mukeem, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	6&7
Dr. Daud Ahmad, Assistant Professor, Department of Urdu, FAA Govt. P. G. College, Mahmoodabad, Sitapur, UP	8
Dr. Uzair Ahmad, Assistant Professor, Department of Urdu, Islampur College, Uttar Dinajpur, West Bengal	9&10
Dr. Zubair Ahmad Siddiqui, Assistant Professor (Urdu), Distance and Online Education, Aligarh Muslim University, Aligarh, UP	11
Dr. Laeeq Ahmad, Assistant Professor, Department of Urdu, Vasanta College for Women, Varanasi, UP	12
Prof. Zia Ur Rehman Siddiqui, Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh, UP	13
Prof. Abbas Raza Nayyar, Department of Urdu, University of Lucknow, Lucknow,UP	14
Prof. Qazi Jamal Husain, Former Professor, Department Urdu Aligarh Muslim University, Aligarh, UP	15
Prof. Ehsanul Haque (Kausar Mazhari), Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	16

PRODUCTION

Mr. Tilak Raj
Assistant Registrar (Pub.)
MPDD, IGNOU, New Delhi

June, 2023
© Indira Gandhi National Open University, 2023
ISBN: 978-93-5568-850-7
All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the copyright holder.
Further information on the Indira Gandhi National Open University courses may be obtained from the University's office at Maidan Garhi, New Delhi-110068 or the official website of IGNOU at www.ignou.ac.in

Printed and published on behalf of the Indira Gandhi National Open University by Registrar, MPDD, Maidan Garhi, New Delhi

CRC Prepared by Tessa Media & Computers, C-206, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, N.D.-25

Printed at : Saraswati Offset Printers Pvt. Ltd., Saraswati House, A-5, Naraina Industrial Area, Ph-II, New Delhi-110028

فہرست

بلاک 1	**میرتقی میرؔ: حیات وشخصیت**	**9**
اکائی 1	عہد میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال	11
اکائی 2	عہد میرؔ کا شعری منظرنامہ	25
اکائی 3	میرؔ کے سوانحی حالات وکوائف	39
اکائی 4	''ذکر میرؔ'' کا تنقیدی جائزہ	51
اکائی 5	میرؔ کے نمائندہ معاصرین	63
بلاک 2	**میرتقی میرؔ: فکروفن (اول)**	**89**
اکائی 6	میرؔ کی قصیدہ نگاری اور قصیدہ ''درمدح آصف الدولہ'' کی تدریس وتفہیم	91
اکائی 7	میرؔ کی مثنوی نگاری اور مثنوی ''دریائے عشق'' کی تدریس وتفہیم	109
اکائی 8	میرؔ کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ ''ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی'' کی تدریس وتفہیم	127
اکائی 9	میرؔ کی دیگر شعری اصناف کا جائزہ	145
اکائی 10	''نکات الشعرا'' کا تنقیدی جائزہ	159
بلاک 3	**میرتقی میرؔ: فکروفن (دوم)**	**175**
اکائی 11	میرؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ	177
اکائی 12	میرؔ کی شاعری میں علم بیان وبدیع کی صورتیں	191
اکائی 13	میرؔ کے شعری امتیازات	215
اکائی 14	میرؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم	229
اکائی 15	میرؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم	247
اکائی 16	میرؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم	267

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

کورس کا تعارف

فاصلاتی نظام تعلیم اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ نظام تعلیم درس وتدریس کی راہیں ہموار کر کے طلبا کو گھر بیٹھے با آسانی تعلیم مہیا کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہ نظام تعلیم قریب کے طلبا کے ساتھ ساتھ دور دراز طلبا کو بھی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا یکساں موقع فراہم کرتا ہے۔ اس میں نہ تو کسی عمر کی پابندی اور نہ ہی باقاعدہ کلاس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لرنرز (سیکھنے والے) اپنی مشغولت اور مصروفیت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں سیلف لرننگ میٹریل (SLM) کے توسط سے طلبا کی نصابی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایس۔ایل۔ایم کو تیار کرنے میں متعدد بنیادی باتوں کا خیال رکھنا اشد ضروری ہوتا ہے، مثلاً طلبا کو دوران مطالعہ استاد کی موجودگی کا احساس دلانا۔ مرکب جملوں کے بجائے مفرد جملوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا۔ عام فہم اور بامحاورہ زبان کا التزام کرنا۔ اکائی میں متعلقہ موضوع کی معلومات کو زیادہ سے زیادہ یکجا کرنا۔ عملی مشق کے مواقع فراہم کرنا۔ ''اغراض ومقاصد''، ''تمہید''، ''اصل موضوع''، ''آپ نے کیا سیکھا؟''، ''اپنا امتحان خود لیجیے''، ''سوالوں کے جوابات''، ''فرہنگ'' اور ''کتب برائے مطالعہ'' کے ذریعے اکائی کو دلچسپ اور موثر بنانے کی حتی المقدور کوشش کرنا وغیرہ۔ تاکہ ایس۔ایل۔ایم کی ساخت اور اسلوب از خود طلبا کی رہنمائی کر سکے۔ اگنو کی ترجیحات میں ہے کہ عام فہم اور بامحاورہ زبان میں عمدہ اور معتبر مواد پر مبنی ("SLM" Self Learning Material) تیار کیا جائے تاکہ ہر سطح اور ہر عمر کے لوگ مطالعہ کر کے اسے با آسانی سمجھ سکیں۔

یہ کورس ''میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ'' ایم۔اے اردو کے فاصلاتی نظام تعلیم سے منسلک طلبا کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یہ کورس مجموعی ۸ کریڈٹ پر مشتمل ہے، جسے دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، جلد اول ''میر تقی میرؔ کا خصوصی مطالعہ'' کے نام سے معنون ہے، جس میں تین بلاک پر مبنی سولہ (۱۶) اکائیاں شامل ہیں اور جلد دوم ''مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ'' کو مختص ہے، اس میں بھی تین بلاک پر مشتمل سولہ (۱۶) اکائیاں شامل ہیں، اس طرح یہ مکمل کورس چھ (۶) بلاک پر مبنی بتیس (۳۲) اکائیوں کو محیط ہے۔

خصوصی مطالعہ طلبا کو شخصیت کی ہمہ جہتی سے متعارف کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ اس میں طلبا کو مخصوص موضوع کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ اور دسترس حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک طرح سے خصوصی مطالعات طلبا کے لیے تحقیقی راہ ہموار کرنے میں بہت معاون اور ذہنی، علمی اور ادبی آبیاری کا باعث ہوتے ہیں، اس لیے روایتی اور غیر روایتی نظام تعلیم میں خصوصی کورسیز (پرچے) کو فوقیت حاصل ہے۔ زیر نظر کورس بھی خصوصی مطالعے میں شامل ہے۔ اس کورس کی ہر اکائی میں اغراض ومقاصد بیان کیے گئے ہیں تاکہ طلبا میں تجسس اور تحرک کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا ذوق وشوق نمو پذیر ہو سکے۔ ''تمہید'' میں اکائی کا مختصر اور مربوط تعارف پیش کیا گیا ہے، جس سے طلبا کو اکائی پڑھنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کیا جا سکے۔ طلبا کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اکائی کے اصل موضوع کو بھی

حسب ضرورت ذیلی عناوین میں منقسم کیا گیا ہے۔ مفہوم کی آسان ترسیل کے لیے اکائی کو سلیس اور عام فہم زبان میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل موضوع کے مطالعے کے بعد ''آپ نے کیا سیکھا؟'' کے تحت طلبا کو پوری اکائی اچھی طرح ذہن نشیں کرائی گئی ہے۔ مزید اصل موضوع کے اختتام پر ''ماحصل'' کی پیشانی لگا کر پورے مطالعہ کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، تا کہ طلبا سہولت کے ساتھ اکائی کا نچوڑ سمجھ سکیں۔ ''اپنا امتحان خود لیجیے'' اور ''سوالوں کے جوابات'' کے عناوین قائم کر کے طلبا کو سرگرم اور متحرک رکھنے کی عملی کوشش کی گئی ہے، جس سے طلبا اپنی صلاحیت کا ازخود جائزہ لے سکیں۔ طلبا کی سہولت کے لیے ہر اکائی میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' شامل کی گئی ہے اور تمام اکائیوں کے آخر میں معاون کتابوں کی فہرست درج کی گئی ہے، تا کہ معاون کتابوں کا مطالعہ کر کے طلبا اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔ زیر نظر کتاب ''میر تقی میرؔ کا خصوصی مطالعہ'' سے متعلق ہے۔ اس میں تین بلاکوں پر مشتمل سولہ (۱۶) اکائیاں ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا بلاک ''میر تقی میرؔ: حیات و شخصیت'' کے عنوان سے مختص ہے۔ اس بلاک کے ضمن میں پانچ (۵) اکائیاں (اکائی نمبر ۱ تا ۵) شامل ہیں۔ پہلی اکائی ''عہد میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال'' میں میر کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات و واقعات اور سانحات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دوسری اکائی ''عہد میرؔ کا شعری منظر نامہ'' میں اس عہد کے شعری تصورات و نظریات اور رجحانات کے ساتھ ساتھ شعری تجربات اور تحریکات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسری اکائی ''میرؔ کے سوانحی حالات و کوائف'' میں میر کا خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم و تربیت، شادی، اولاد، مشاغل اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ چوتھی اکائی ''ذکر میرؔ کا تنقیدی جائزہ'' میں ان کی آپ بیتی سے بحث کی گئی ہے۔ پانچویں اکائی ''میرؔ کے نمائندہ معاصرین'' کے لیے مخصوص کی گئی، اس اکائی میں اول میر کے بیشتر معاصرین کی فہرست تیار کی گئی اور دوم چند اہم اور نمائندہ منفرد رنگ و آہنگ اور فکر کے شعرا کی حالات زندگی، خدمات، خصوصیات اور نمونۂ کلام کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس بلاک کا مطالعہ طلبا کے لیے بہت کارآمد ہے کیوں کہ شامل نصاب اکائیاں دو جہتوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی جہت میر کے عہد کو سمجھنے میں معاون ہے اور دوسری جہت میر کی سیرت و شخصیت کی تفہیم میں نہایت کارآمد ہے۔ لہٰذا اس بلاک کو پڑھنے کے بعد طلبا عہد میر کو سمجھ کر میر کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر پڑنے والے عہد کے اثرات سے واقف ہو سکیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ شخصیت اور تخلیق اپنے عہد کی پروردہ ہوتی ہے جس کو سمجھے بغیر نہ تو پورے طور سے فن کار کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی فن پارے کو۔

دوسرا بلاک ''میر تقی میرؔ: فکر و فن (اول)'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس بلاک میں کل پانچ (۵) اکائیاں (اکائی نمبر ۶ تا ۱۰) شامل ہیں۔ چھٹی اکائی ''میرؔ کی قصیدہ نگاری اور قصیدہ 'در مدح آصف الدولہ' کی تدریس و تفہیم''، ساتویں اکائی ''میرؔ کی مثنوی نگاری اور مثنوی 'دریائے عشق' کی تدریس و تفہیم''، آٹھویں اکائی ''میرؔ کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ 'ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی' کی تدریس و تفہیم''، نویں اکائی ''میرؔ کی دیگر شعری اصناف کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مخصوص کی گئی ہیں۔ یہ چاروں اکائیاں میرؔ کے ان شعری اصناف کا احاطہ کرتی ہیں جن میں وہ عمومی سطح سے مقبول و معروف نہیں ہوئے۔ یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیائے ادب میں ان کی غزل گوئی

مذکورہ دیگر شعری اصناف پر حاوی رہی۔ اس لیے خصوصاً میر کی شاعری کے سبھی صنفی تجربات کے اوصاف و امتیازات اور متن کی شمولیت مع تشریحات سے میر کی ہمہ جہتی کو واضح کیا گیا ہے، تا کہ طلبا بخوبی واقف ہو سکیں کہ میر محض غزل ہی کے شاعر نہیں، بلکہ وہ اپنے عہد کی مروجہ تمام شعری اصناف کے بھی باکمال شاعر ہیں۔ دسویں اکائی ''نکات الشعرا کا تنقیدی جائزہ'' کو محمول ہے، جس میں بالتفصیل ان کے تذکرے کی اہمیت افادیت اور معنویت کو زیر بحث لا کر ان کی فن شناسی اور شعر شناسی کو واضح کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ پورا ابلاک میرؔ کی مختلف النوع فکری اور فنی ہمہ جہتی سے عبارت ہے، جس کے مطالعے سے طلبا میرؔ کے مختلف شعری اصناف کی قدر و قیمت اور ان کی عظمت کو سمجھ سکیں گے۔

تیسرا ابلاک ''میر تقی میرؔ: فکر و فن (دوم)'' کی پیشانی کے ساتھ چھ(۶) اکائیوں (اکائی نمبر ۱۱ تا ۱۶) کو محیط ہے۔ گیارہویں اکائی ''میرؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مخصوص کی گئی ہے۔ جس میں میر تقی میرؔ کی غزل گوئی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر ان کی غزلوں کی خصوصیات، امتیازات، شعری اختصاصات اور قدر قیمت کو پیش کیا گیا ہے۔ بارہویں اکائی ''میرؔ کی شاعری میں علم بیان و بدیع کی صورتیں'' کے نام سے مختص کی گئی ہے، جس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ اور صنائع لفظی و معنوی کی روشنی میں میر کی شاعری کا مفصل اور مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔ تیرہویں اکائی ''میرؔ کے شعری امتیازات'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس اکائی میں میرؔ کی تمام شعری اصناف کے حوالے سے ان کے شعری امتیازات کو واضح کیا گیا ہے۔ چودھویں، پندرھویں اور سولہویں اکائیاں خصوصی طور پر میر کی غزلوں کے متن پر مشتمل ہیں۔ ردیف 'الف، ن اور ی' کی پانچ پانچ غزلوں کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ تمام غزلوں میں کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ غزلوں کے انتخاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ میرؔ کے تمام رنگ و مزاج اور اسلوب یکجا ہو جائیں۔ شامل نصاب تمام غزلوں کی عام فہم تشریح و توضیح بھی کی گئی ہے، تشریحات میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اصطلاحی اور مشکل الفاظ کی توضیح اور شعر میں در آئے شعری محاسن کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے تا کہ طلبا با آسانی شعر سے مفہوم اخذ کرنے اور متن فہمی کا شعور اور سلیقہ اپنے اندر پیدا کر سکیں۔

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

1

میر تقی میرؔ: حیات و شخصیت

بلاک 1 کا تعارف

اکائی 1
عہد میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال 11

اکائی 2
عہد میرؔ کا شعری منظر نامہ 25

اکائی 3
میرؔ کے سوانحی حالات و کوائف 39

اکائی 4
''ذکر میرؔ'' کا تنقیدی جائزہ 51

اکائی 5
میرؔ کے نمائندہ معاصرین 63

بلاک 1 تعارف

پہلا بلاک ''میر تقی میرؔ: حیات وشخصیت'' کے عنوان سے مختص ہے۔ اس بلاک کے ضمن میں پانچ (۵) اکائیاں (اکائی نمبرا تا ۵) شامل ہیں۔ پہلی اکائی ''عہد میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال'' میں میر کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات و واقعات اور سانحات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دوسری اکائی ''عہد میرؔ کا شعری منظر نامہ'' میں اس عہد کے شعری تصورارت ونظریات اور رجحانات کے ساتھ ساتھ شعری تجربات اور تحریکات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسری اکائی ''میرؔ کے سوانحی حالات و کوائف'' میں میر کا خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم وتربیت، شادی، اولاد، مشاغل اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ چوتھی اکائی ''ذکر میرؔ کا تنقیدہ جائزہ'' میں ان کی آپ بیتی سے بحث کی گئی ہے۔ پانچویں اکائی ''میرؔ کے نمائندہ معاصرین'' کے لیے مخصوص کی گئی، اس اکائی میں اول میر کے بیشتر معاصرین کی فہرست تیار کی گئی اور دوم چند اہم اور نمائندہ منفرد رنگ و آہنگ اور فکر کے شعرا کی حالات زندگی، خدمات، خصوصیات اور نمونۂ کلام کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس بلاک کا مطالعہ طلبا کے لیے بہت کارآمد ہے کیوں کہ شامل نصاب اکائیاں دو جہتوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی جہت میر کے عہد کو سمجھنے میں معاون ہے اور دوسری جہت میر کی سیرت وشخصیت کی تفہیم میں نہایت کارآمد ہے۔ لہٰذا اس بلاک کو پڑھنے کے بعد طلبا عہد میر کو سمجھ کر میر کی شخصیت اور ان کے فکر وفن پر پڑنے والے عہد کے اثرات سے واقف ہوسکیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ شخصیت اور تخلیق اپنے عہد کی پروردہ ہوتی ہے جس کو سمجھے بغیر نہ تو پورے طور سے فن کار کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی فن پارے کو۔

اکائی 1 عہدِ میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 عہدِ میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال

1.3.1 عہدِ میرؔ کی سیاسی صورتِ حال

1.3.2 عہدِ میرؔ کی سماجی صورتِ حال

1.3.3 عہدِ میرؔ کی تہذیبی صورتِ حال

1.3.4 ماحصل

1.4 آپ نے کیا سیکھا؟

1.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1.6 سوالوں کے جوابات

1.7 فرہنگ

1.8 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- عہدِ میرؔ کی سیاسی صورت حال سے واقف ہوں گے۔
- عہدِ میرؔ کی سماجی صورت حال سے متعارف ہوں گے۔
- عہدِ میرؔ کی تہذیبی صورتِ حال سے روشناس ہوں گے۔
- عہدِ میرؔ کی اہمیت، افادیت اور معنویت نیز اس کے ادبی منظرنامے سے باخبر ہوں گے۔
- عہدِ میرؔ کے سیاسی سماجی اور تہذیبی اثرات میر کی شاعری پر کس قدر مرتب ہوئے؟ سے آگاہ ہوں گے۔

1.2 تمہید

عزیز طلبا! ''میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ'' میں آپ کا استقبال ہے۔اس کورس کی پہلی اکائی ''عہد میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذبی صورت حال'' کے عنوان سے مختص ہے۔جس میں آپ اردو کے ایک اہم اور معتبر

شاعر میر تقی میرؔ کے عہد کا مطالعہ کریں گے۔ان کے عہد کی تہذیب وثقافت کو جانیں گے۔اس دور کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال سے بھی متعارف ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی عہد کے تعین میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی محرکات کا خصوصی اور بنیادی دخل ہوتا ہے۔لہٰذا کسی شخصیت کا مفصل مطالعہ اس کے عہد کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں، کیوں کہ جس عہد میں فن کار اپنا فن پارہ تخلیق کرتا ہے اس کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کی تخلیق کو متاثر کرتے ہیں۔ میر کی شخصیت کے تعین میں بھی ان کے عہد کا اہم کردار ہے۔ میر کا عہد انتشار پذیری کا شکار تھا۔لہٰذا آپ اس اکائی میں میرؔ کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

1.3 عہدِ میرؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال

1.3.1 عہدِ میرؔ کی سیاسی صورتِ حال

سترھویں صدی میں مغلیہ سلطنت اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ جس میں بنیادی کردار اورنگ زیب عالمگیر کا تھا۔ انھوں نے برصغیر کو نہ صرف سیاسی اتحاد سے روشناس کرایا تھا بلکہ وسیع تہذیبی ہم آہنگی پیدا کر کے اس کو مضبوط ثقافتی ڈھانچہ بھی فراہم کیا تھا۔ اورنگ زیب کے دور میں معاشرے کی تخلیقی وفکری صلاحیتیں اچھی طرح پھل پھول رہی تھیں، کیوں کہ انہیں کی کاوش سے ملک میں بہت مدت کے بعد سیاسی اتحاد قائم ہوا تھا۔شمال وجنوب کے باہم ملنے سے لوگ آپسی تبادلۂ خیالات میں ہم آہنگی محسوس کر رہے تھے اور سیاسی انتشار سے چھٹکارے کے سبب وہ دوسری صلاحیتوں کی طرف بھی توجہ دینے لگے تھے۔ لہٰذا یہ صلاحیتیں اپنے جوبن پر تھیں۔ ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر وفات پا گئے۔ان کی وفات، عہدِ میر کی سیاسی وسماجی حالات کے بدلنے کا ایک اہم واقعہ ہے۔ان کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت نے زوال پذیری کی طرف اپنا رختِ سفر باندھا۔ان کے جانشینوں نے عالی ہمتی کے بجائے پست ہمتی، بصیرت کے بجائے لالچ سے کام لے کر رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ حالات ہر طرف دگر گوں ہوتے جا رہے تھے۔اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان کا بڑا بیٹا معظم شاہ بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشیں ہوا۔وہ چار سال بعد ۱۷۱۲ء میں وفات پا گیا۔ان کے بیٹوں میں تخت شاہی کے حصول کے لیے خانہ جنگی ہوئی جس نے مغلیہ سلطنت کے مکمل زوال کے لیے اسباب پیدا کیے۔تختِ شاہی کے حصول کی جنگ میں جہاندار شاہ نے بازی لی اور سلطنت کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔لیکن ان کے ساتھ مسئلہ تھا کہ وہ افیم کا عادی اور شراب کی لت میں گرفتار تھا اور رات دن لال کنور کے عشق میں مست رہ کر مبتذل جنسی اطوار میں ملوث رہتا تھا۔ جہاندار شاہ نے اپنی عیش پرستی اور لعل کنور کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے فرخ سیر سے شکست کھائی اور اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا۔ان کے بعد سادات بارہہ کی مدد سے فرخ سیر تخت شاہی پر بٹھایا گیا۔ ۱۷۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے اپنی سفارت بھیجی جس میں ہیملٹن بھی شامل تھے۔انہوں نے بادشاہ کا علاج کیا تھا اس لیے بادشاہ نے بہ خوشی ان کو مراعات دے

دیں۔ فرخ سیر نے ساداتِ بارہہ کے شکنجے سے نجات پانے کے لیے اپنا گروہ تیار کیا، جس سے شاہی دربار سازشوں اور دغا بازوں کا اڈہ بن گیا۔ آخر میں فرخ سیر کو بھی اندھا کیا گیا اور بے دردی کی موت مارا گیا۔ ساداتِ بارہہ نے پہلے رفیع الدولہ اور پھر رفیع الدرجات پھر روشن اختر کو محمد شاہ کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا، مگر سب نکمے ہی ثابت ہوئے۔

میر کی پیدائش سے تین سال پہلے محمد شاہ رنگیلا کی پیدائش ۱۷۱۷ء میں ہوتی ہے اور اورنگ زیب کے بعد طویل مدت تک وہ تخت پر بیٹھتا ہے۔ لیکن وہ بھی سابقہ بادشاہوں کی طرح بزدل، عیش پرست اور کاہل تھا۔ اس نے بھی افیون کھا کھا کر اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ مرہٹے، سکھ، روہیلے اور جاٹوں نے اپنی شورشوں سے سلطنت کے در و دیوار ہلا دیے تھے۔ ایرانی، تورانی آویزش کا فائدہ یہی مرہٹے، سکھ، روہیلے، جاٹ اور دوسری اقوام اٹھا رہی تھیں، جس سے ہر طرف سیاسی پراگندگی پھیل گئی۔ نظام الملک آصف جاہ، تورانی گروہ کا لیڈر اور وزیر الممالک تھا اور امیر خان میر اسحاق انجام اور اسحاق خان نجم الدولہ ایرانی جماعت کی پیشوائی کر رہے تھے۔ نظام الملک اپنے مخالفین کا مقابلہ کرنے سے بے بس و مجبور ہو کر نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، یوں اس نے ۱۷۳۹ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ بادشاہ کی طرف سے کمک نہ پہنچنے پر ناظمِ لاہور نے ہتھیار ڈال دیے اور نادر شاہ نے لاہور فتح کیا۔ اس خبر کو پا کر محمد شاہ اپنی فوج لے کر کرنال روانہ ہوا لیکن شکست سے دوچار ہوا۔ بعد میں امرا کی بدولت صلح ہو گئی لیکن ایک دن جب نادر شاہ کے قتل کی افواہ اڑ گئی تو شہر کے کچھ لوگوں نے ایرانی فوجیوں پر حملہ کیا جس میں تقریباً سات سو کے قریب فوجی مارے گئے۔ جب نادر شاہ نے یہ خبر سنی تو انہوں نے دہلی کی غارت گری اور قتلِ عام کا حکم صادر کیا۔ جس میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب افراد کو قتل کیا گیا۔ ان حالات سے سیاسی طور پر دہلی مفلوج ہو کر رہ گئی اور اقتصادی طور پر اس کو بہت بڑا دھچکا لگا۔

اسی زمانے میں میر کے والد وفات پا گئے اور میر آگرے سے دہلی آئے۔ خواجہ باسط کے توسط سے امیر الامرا صمصام الدولہ کے دربار میں رسائی پا کر ایک روپیہ یومیہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا، لیکن ۱۷۳۹ء میں صمصام الدولہ، نادر شاہ کے حملے میں مارے گئے، لہٰذا میر کا یہ وظیفہ بھی بند ہو گیا۔ نادر شاہ کے آٹھ سال بعد احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء تا ۱۷۶۹ء دہلی پر نو حملے کیے۔ جن کی پاداش میں دہلی میں ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور لوگ یہاں سے نکل کر لکھنو، مرشد آباد، شاہجہاں پور، ٹانڈہ یا حیدر آباد کی طرف کوچ کرنے لگے۔ اس غارت گری میں میر کا مکان بھی منہدم ہوا اور ان کو بھی در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔

محمد شاہ کے انتقال کے بعد صفدر جنگ نے احمد شاہ بہادر کو تختِ شاہی پر بٹھایا۔ اور اس کو خود وزارت کا عہدہ ملا۔ اس زمانے میں اندرونی خلفشار اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس آپسی رسا کشی سے تنگ آ کر میر نے گوشہ نشینی اختیار کی اور پڑھائی کی طرف توجہ دی۔ عماد الملک نے احمد شاہ کو تخت شاہی سے معزول کر کے انھیں اور ان کی ماں کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں اور عزیز الدین بن معز الدین جہاں دار شاہ کو عالمگیر ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا

گیا۔ میر نے اسی کے متعلق لکھا:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھیں خاک پا جن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

پانچویں حملے کے وقت ابدالی دہلی میں داخل ہوا۔ جاٹ سردار سورج مل کے سوا سب نے اس کی اطاعت قبول کی۔ ابدالی بے شمار دولت اپنے ساتھ لے گیا۔ اس موقعے پر ابدالی نے جو تشدد ڈھایا میر نے اپنی آپ بیتی میں اس کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ سودا، حاتم، جعفر علی حسرت، مصحفی اور قائم چاند پوری کے علاوہ میر نے بھی اس پر شہر آشوب لکھے۔

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ این جا نیست
از ہر کہ نشاں جستم گفتند کہ پیدا نیست

(جس کے بارے میں بھی بات کی (معلوم کیا) جواب ملا، یہاں نہیں ہے۔ جس کے نشاں ڈھونڈا کہا گیا اس کا پتہ نہیں یا خبر نہیں، کیا ہوا۔)

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانہ ای
بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانہ ای

(میں نے کسی کھنڈر میں جو اینٹ پڑی دیکھی وہ کسی صاحبِ خانہ کے احوال کا ایک ورق معلوم ہوتی تھی۔)

نواب بہادر جاوید خان کے قتل کے بعد میر بے روزگار ہو گئے تھے۔ وزیر دیوان مہا نرائن نے میر کو کچھ نقدی بھیجی اور اپنے یہاں بلایا، جس کی وجہ سے میر کے یہ دن فراغت سے گزرے۔ اس کے بعد میر راجا جگل کشور کے ہاں ملازم ہو گئے تھے لیکن مشکلات سے تنگ آ کر انہوں نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ بھاؤ نے دہلی کے قلعے پر قبضہ کیا اور شاہ جہاں ثانی کو معزول کر کے شہزادہ جواں بخت کو تخت پر بٹھایا اور منصبِ وزارت شجاع الدولہ کے نام مشہور کر دیا۔

۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے جنگِ پلاسی میں مغلوں کو شکست دے کر صوبہ بنگال پر اپنا اقتدار جما لیا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں انگریزوں نے شہزادہ عالی گوہر یعنی شاہ عالم ثانی، شجاع الدولہ، میر قاسم وغیرہ کو شکست دی۔ اس جنگ میں شکست کے بعد شاہ عالم کا قیام الہ آباد میں رہا اور عملاً وہ انگریزوں کے ماتحت یا زیرِ حراست تھے۔ اپنی مایوسی اور شکست کے غم کو دور کرنے کے لیے اس کے امرا نے دل بہلائی کی خاطر ناچنے، گانے والی عورتیں پیش کیں۔ جس کی وجہ سے دربار رقص و سرود کا مرکز بن گیا، عیش کوشی اور کاہلی اہلِ دربار کا شیوہ ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد اکبر ثانی اور بہادر شاہ ظفر بھی انگریزوں کے ماتحت تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے بعد پوری طرح مغلیہ سلطنت کا زوال ہو گیا۔

اس دور کی کچھ جنگوں میں میر نے بھی شرکت کی ہے۔ ۱۷۴۸ء میں وہ رعایت خان کے ساتھ گئے جہاں مغل فوج کا مقابلہ احمد شاہ ابدالی کی فوج سے ہوا۔ جس میں نواب قمرالدین خان مارے گئے۔ پشکر (راجستھان) کی مہم میں بھی وہ ان کے ساتھ گئے۔ جب صفدر جنگ نے احمد خان بنگش پر چڑھائی کی تو اسحاق خان نجم الالدولہ کے ساتھ فرخ آباد تک گئے۔ ۱۷۷۱ء میں وہ وہ جنگِ سکرتال میں بھی شریک تھے۔ عزیز طلبا! یہ سیاسی حالات کا مختصر خاکہ ہے جو میر کے دور میں رونما ہوئے۔

1.3.2 عہدِ میرؔ کی سماجی صورتِ حال

عزیز طلبا! اس موضوع پر بات کرنے سے پہلے آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ سماج ہمیشہ اپنی تہذیب سے ہی پہچانا جاتا ہے اور سماج جس نہج پر زندگی گزار رہا ہوتا ہے وہی اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ سماجیات کے مطالعے میں ماحول کے اثرات، مسائل، حقائق، تجربات اور مشاہدات کا بہت گہرا دخل ہوتا ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے وفات تک سماج سے منسلک رہتا ہے۔ اس کے طور طریقے، عادات و اطوار، رسوم و رواج اسی سماج میں اور اسی کے ذریعے پروان چڑھتے ہیں۔ لہٰذا کسی کی شخصیت کی تعمیر و تخلیق میں سماجی اثرات کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ سماجی تغیرات کا عمل صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تمام سماج ایک جیسے ہیں۔ انسان کا مزاج ارتقا پذیر ہے، لہٰذا وہ کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر نسل اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ہی حیات و کائنات کے مسائل سے نبرد آزما ہوتی ہے۔

مغلیہ سلطنت میں آپسی نا چاقی کی وجہ سے نہ صرف سیاسی استحکام کمزور ہو رہا تھا بلکہ ملک کی معیشت بالخصوص تباہی کی طرف جا رہی تھی۔ بقول محمد عمر "شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی بصیرت سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہندوستان کا اقتصادی نظام بگڑ چکا ہے اور مذہب کی صحیح فکر بیدار کرنی بھی ضروری ہے۔" دوسرے علما، مشائخ اور مفکرین نے بھی اس پستی کی طرف توجہ دلائی تھی لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور نتیجتاً بائیس صوبوں کی مغللیہ سلطنت قلعہ معلیٰ کی چار دیواری تک سمٹ کے رہ گئی۔ میرؔ نے "ذکرِ میر" میں اعظم خان کلاں کا واقعہ لکھا ہے جو محمد شاہ کے عہد میں شش ہزاری امیر تھے کہ وہ اپنی تنگ دستی کے بابت ان کے بیٹے سے ملے۔ انہوں نے خیر و عافیت معلوم کی، حقہ، قہوہ پلایا تو میر کی زبان پر برجستہ یہ شعر موزوں ہوا:

امروز کہ چشمِ من و عرفی بہم افتاد
باہم نگرستیم و گرستیم و گذشتیم

(آج میری اور عرفی کی آنکھیں مل گئیں تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور روئے اور چل دیے۔)

ایسے ہی چند اور شعر پڑھے جس سے خان صاحب فکر مند ہوئے۔ میر نے اس کا سبب پوچھا تو کہا جب تم شہرِ دلی میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائی اور حلوے منگواتے تھے آج حالت ایسی ہے کہ کچی کھانڈ بھی میسر نہیں جو تمہارے لیے ایک پیالہ شربت بنا سکوں:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ جیسے جیسے انگریزی اقتدار بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا ویسے ویسے لوٹ کھسوٹ اور بدحالی بھی پھیلتی جا رہی تھی۔خزانہ خالی تھا، تجارت بحران کا شکار ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے دست کار، ہنرمند اور کاریگر پریشان حال ہو رہے تھے۔کسان کے لیے پیٹ پالنا اور محصول ادا کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا، ذرائع پیداوار ناکارہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس سکے کے دوسرے رخ کی طرف اگر نظر دوڑائیں تو ملی اور مذہبی وفاداریاں خودغرضی کا شکار ہوئیں۔ملت اپنے بلند اخلاقی مقام سے پستی کے گڑھے میں گر گئی۔ابتذال نے شائستگی کی جگہ لے لی اور اخلاقی قدریں بے وقعت ہو گئیں۔قہقہے، رنگ رلیاں، جنسی بد اطواریاں، شراب نوشی، چراغاں، سیر و تفریح، لذیذ غذائیں کھانا، شوخ اور بھڑکیلے لباس پہننا، رات دن آرائش میں مشغول رہنا اس دور کے معاشرے کی عام روش تھی۔اس طور طریقے نے نہ صرف ان امرا اور رؤسا کو خراب کیا بلکہ اس دور کے معاشرے میں بھی یہ برائیاں سرایت ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بالخصوص لکھنو والوں کے ہاں ادب میں یہ تعیش پسندی پائی جاتی ہے۔ان واقعات نے معاشرے کی تخلیقی صلاحیتوں کو مجروح و متاثر کر کے رویوں اور تخلیقی میلانات کی تشکیل کی۔ان حالات و عوامل کا اثر یہ ہوا کہ روایتی معاشرے کے فرد کے کردار میں بحران پیدا ہوا۔وہ ملت جو سپاہی پیدا کرتی تھی اب بانکے پیدا کرنے لگی، مذہب کی جگہ اوہام پرستی، تعویذ گنڈوں، جھاڑ پھونک، بے یقینی نے لے لی۔ بہادری، شجاعت اور عسکری مزاج ماند پڑ چکا تھا۔اس سماج کے افراد جہاں ایک طرف شراب پر تکیہ کرتے تھے تو وہیں دوسری طرف تصوف اور پیری مریدی کا سہارا لیتے تھے۔انہوں نے بزمِ آرائی، صہبا پرستی، عیش کوشی کو صوفیت سے ملا کر اپنے لیے جواز کی صورت پیدا کی تھی، درحقیقت نہ وہ دنیا کے رہ گئے تھے نہ دین کے، لیکن خوش فہمی میں وہ دونوں کے تھے اور یہی اکثر معاشروں کے افراد کا المیہ تھا۔کوئی مقصد سامنے نہ ہونے کی بنا پر سازشوں، سفلوں، بانکوں، رنڈی بازوں، بھڑووں اور خواجہ سراؤں کی ایک کھیپ اس دور میں لوگوں کی صورت میں ملتی ہے اور بدقسمتی یہ کہ انہی لوگوں نے دربارِ شاہی پر بھی اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔طوائف اس دور میں اتنی زیادہ اہم ہو گئی تھی کہ شرفا و امرا ان سے ملنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔

مسلمانوں میں بھی شرافت کا معیار اس بات کو سمجھا جاتا تھا کہ فرد نوکر پیشہ ہو، دربارِ سرکار میں پہنچ رکھتا ہو یا کسی امیر کا مصاحب ہو۔سید یا مرزا کے لیے ضروری تھا کہ وہ بادشاہ کے دربار یا کسی امیر کی سرکار میں پہنچ رکھتا ہو۔

1.3.3 عہدِ میرؔ کی تہذیبی صورتِ حال

فرد تنہا آدمی/انسان کو کہتے ہیں۔جب یہ افراد آپسی ضرورتوں کے لیے باہم ہوتے ہیں تو وہی سماج بن جاتا ہے۔

سماج یا معاشرے کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے لیے قوانین بنائے جاتے ہیں، یوں ہمارے سامنے ایک منظّم سماج / سوسائٹی جنم لیتی ہے۔ جب ایک طویل زمانے تک سماج کے یہ افراد روایتی خطوط کے مطابق زندگی گزارتے ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے تو ان کے اس طریق کار اور عمل کو کلچر/ ثقافت کہا جاسکتا ہے۔ یعنی رہن سہن، بود و باش، کھانا پینا، شادی بیاہ، مرگ و وفات، کھیتی باڑی وغیرہ۔ اسی لیے کلچر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''یہ کسی بھی سماج/ علاقے کا کلی طور پر زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ آرنالڈ ٹائن بی کے نزدیک ثقافت/ کلچر میں مذہبی اور اخلاقی عنصر لازمہ ہے۔ تہذیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا تحریر اور دھات کی ایجاد سے ہوئی۔ تاریخ کی ابتدا جیسے تحریر کے آغاز سے ہوئی ہے اسی طرح تہذیب کی بھی یہیں سے سمجھنی چاہیے۔'' کچھ محققین کی رائے ہے کہ تہذیب کی بنیاد سماجی/عوامی تنظیم پر ہے۔ جس کی مثالیں شہر، اور ضلعوں میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے گاوں/ دیہات کے برعکس شہری لوگوں کو مہذب سمجھا جاتا ہے۔ ''تہذیب کے معنی ذہنی نشو ونما اور ارتقا کے ہیں۔'' یہ دراصل اجتماعی طور پر زندگی گزارنے کا نام ہے۔

آج جو کچھ ہم اپنے گرد مشاہدہ کر رہے ہیں ان میں سے بہت سے افعال و اعمال میر کے عہد میں بھی پائے جاتے تھے۔ جہاں تک بچے کی پیدائش کی بات ہے تو پیدائش کے وقت اس کے کان میں تکبیر کہی جاتی تھی۔ چھٹے یا ساتویں دن عقیقہ کیا جاتا تھا، بال مونڈے جاتے اور اس کے وزن کے برابر سونا یا چاندی مستحقین میں بانٹا جاتا اور بچے کا نام تجویز کیا جاتا تھا۔ پانچویں سال بسم اللہ خوانی ہوتی تھی۔ سب سے پہلے قرانِ پاک کی تعلیم دی جاتی۔ سات برس کی عمر میں نماز کی ہدایت کی جاتی۔ سنِ بلوغت کو پہنچنے سے پہلے ختنہ کیا جاتا اور اس موقعے پر ضیافتیں کی جاتی تھیں۔ بلوغت کے بعد شادی ہوتی تھی جو کہ آج بھی ہمارے سماج میں تقریباً اسی نہج پر باقی ہے۔

عہدِ میر میں بھی شادیاں بڑے دھوم دھام سے کی جاتی تھیں۔ اس وقت کی شادیاں تین رسموں، ساچق، مہندی اور بارات پر مبنی ہوتی تھی۔ تیل چڑھانا، ہاتھ میں کنگن یعنی شادی کے ڈورے کو پہنانا، سہرا باندھنا اور دولہا کے جوڑوں کا دولھن کے گھر سے آنا خاص رسمیں تھیں۔ برات کی روانگی کے ساتھ آتش بازی کثرت سے چھوڑی جاتی تھی۔ برات کا دولھن کے گھر پر پہنچنے کے وقت دِھنگانا کی رسم بھی عام تھی۔ رخصتی کے وقت دولھن یا دولھے کے بڑے بھائی دولھن کو اپنی گود میں اٹھا کر چنڈول میں بٹھاتے تھے۔ اس پر پیسے نچھاور کیے جاتے تھے۔ شجاع الدولہ کی شادی میں ساٹھ لاکھ اور آصف الدولہ نے اپنے متبنیٰ وزیر علی خان کی شادی میں پچاس لاکھ روپے خرچ کیے تھے۔

اس دور میں عام طور سے ریشم، مخمل اور کم خواب لباس میں استعمال ہوتا تھا۔ ٹکوچیہ، پیشواز، شاہ اجیدہ، فرجی، فرگل، دستار، چیرہ، جامہ، کمر بند، گیگھیا شاہانہ لباس تھے، جو عام طور پر بھڑکیلے ہوتے تھے۔ اس میں تراش خراش کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عوام وخواص میں رومال کا استعمال بہت عام تھا۔ عورتیں اوڑھنی یا دوپٹے سے سر کو ڈھکا کرتی تھیں اور شاہی گھرانے کی خواتین ٹوپی بھی پہنا کرتی تھیں اور پردے کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ محمد عمر

کے مطابق لہنگا خادمائیں اور نچلے طبقے کی عورتیں پہنا کرتی تھیں۔آرسی، ہار، موتی کی لڑی، کڑے، بلاق، بالیاں، کان کا گوہر، بالا اس دور میں عورتوں کے عام زیورات تھے۔ یہ عورتیں سنگار کی بہت شائق تھیں اور ابوالفضل کے بیان کردہ سولہ سنگار میں سے اکثر کا استعمال کرتی تھیں۔ان عورتوں میں پان کھانے کا رواج بھی عام تھا۔مردوں میں حقہ بھی عام تھا۔ ماکولات ومشروبات میں قلیہ سادہ،قلیہ چاشنی دار، دوپیازہ، ماہی، ساموسہ، بادام وکباب خاص و عام میں مقبول تھے البتہ چاول کوسب پسند کرتے تھے اور بہت رغبت سے کھاتے تھے۔ روٹیوں میں باقر خانی، نان میں شیر مال، بادام، بیسی، ذاتی، بیدھول، وارمی، جوار۔اسی طرح حلوؤں میں کیاہ، ادرک، بادام، پستہ،شمس،شیر، ناخد،نشاستہ، فالودہ،فرنی، کھجور۔گلگلوں میں شیر، جور، انبہ استعمال ہوتے تھے۔ پھلوں میں آم، خربوزہ، سردہ، سیب، انگورلوگ بہت پسند کرتے تھے۔مغل کھانوں میں لذت کے ساتھ ساتھ نفاست کا بھی خیال رکھا جاتا تھا اور وہ اس کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے تھے۔چٹنیوں کی ہی تقریباً ساٹھ قسمیں تھیں۔سواریوں میں گھوڑے، خچر، اونٹ، ہاتھی، گدھے، پالکی، نالکی، ہوادار، تختِ رواں، بہل، چھکڑا، رتھ، چوپالہ، بیل گاڑی استعمال کیے جاتے تھے۔

مذہبی تہواروں میں عیدین، محرم، مرثیہ خوانی کی مجالس، شبِ برات، بارہ ربیع الاول، جشنِ نوروز۔ میلے ٹھیلوں میں بسنت، ناگل، اعراس۔کھیل تماشوں میں شطرنج، چوپڑ، پتنگ بازی، کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، پٹے بازی، غبارہ بازی، گیندہ بازی، آنکھ مچولی، گلی ڈنڈا، آہو بازی، جھولا وغیرہ پائے جاتے تھے۔رقص وسرود کی مجلسیں بھی بڑے شہروں میں منعقد ہوتی تھیں اور پیشہ ورمردوخواتین اس کے لیے آسانی سے مل جایا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کو دربار میں ملازم بھی رکھا جاتا تھا۔محمد شاہ کے دربار میں ۲۲ رقاصائیں اور ۲۴ گویئے ملازم تھے۔مشہور رقاصہ نور بائی بھی اسی دربار سے منسلک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں اس فن نے عروج حاصل کیا۔ بزدلی کے سبب انہوں نے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے سپردگی پسند کی۔حتیٰ کہ ہر مذہبی وغیر مذہبی تقریب میں رقص وسرود کو دخل تھا، بلکہ مسلمانوں کے گھروں میں بھی قوالیوں پر رقص ہوتا تھا۔ رات کو بہروپوں اور نقالوں کے تماشے دکھائے جاتے تھے۔بعض امیر زادے شرفا عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے۔ قوالی، شب بازی، بھگت بازی، بھانڈ بازی، دار/ نٹ بازی، نقالی، قصہ خوانی، لطیفہ گوئی، جرہ باشی، تفریح کے دوسرے ذرائع تھے۔فنونِ حرب میں تیراندازی، کُشتی، گھوڑ دوڑ، شکار، تیراکی، پٹہ ہلانا، بانک بنوٹ، برچھا، بانا یا لٹھ بازی، کٹار بازی، جل بانک، ہاتھی کی سواری، تلوار بازی میں لوگ اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس کرنا، چھڑیاں، جھنڈے گاڑنا، جلوس نکالنا عام تھا۔توہم پرستی مذہبی عقیدے میں داخل ہوگئی تھی۔ ہر بڑے خاندان سے کوئی نہ کوئی نجومی وابستہ ہوتا تھا۔ ماہِ صفر کے تیرہ دن منحوس مانے جاتے تھے۔عورتوں میں چیچک کی وبا پھیلنے پر دروازے پر آم کے پتے لٹکائے جاتے تھے، لڑکوں کے سروں پر شاہ مدار اور دوسرے بزرگوں کے نام کی چوٹیاں رکھی جاتی تھیں۔جن یا بھوت کا اثر ہونے کی صورت میں خلاصی کے لیے مٹھائی تقسیم

کی جاتی یا جانور بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔تعویذ، گنڈے، ٹونے ٹوٹکوں کا بھی رواج عام تھا، فال اور شگون پر بھی لوگوں کا عقیدہ تھا۔ جب میر کے والد علی متقی روٹھ کر لاہور جا رہے تھے تو مجبوراً ان کی ماں نے آئینے پر پانی ڈال کر شگون پورا کیا۔ میر پر جب جنون کا دورہ پڑ گیا تو ان پر سیانوں نے جھاڑ پھونک کی۔نظر بد سے بچنے کے لیے ماتھے پر کالے ٹیکے لگائے جاتے تھے، نچھاورا تارا جاتا تھا۔علاج کے لیے طبِ یونانی کا عام استعمال ہوتا تھا۔ دیسی اور گھریلو علاج سے بھی لوگ بیماریوں سے بچاؤ کرتے تھے۔خواجہ خضر کی کشتی پر بھی لوگ یقین کرتے تھے۔ حضرت قطب الاقطاب کی درگاہ کا لوگ طواف کرتے تھے۔نصیر الدین چراغ دہلی کے مزار کی زیارت اتوار کو ہوتی تھی، دیوالی کے مہینوں میں زیادہ ہجوم رہتا تھا۔ ہندو مسلمان دونوں یکساں زیارت کرتے تھے۔

جابجا سبزہ تماشا باغ اور معشوق و مے
خضر نے بھی عمر بھر دیکھا نہیں دلی سا شہر

(ناجی)

امرد پرستی بھی میر کے دور کا ایک اہم مشغلہ تھا۔حد یہ کہ ایک سیدزادے میر امان اللہ جسے میر کے والد علی متقی 'برادرِ عزیز' کہتے تھے اور ان کو راہِ راست پر لگا دیا اور معرفت کے درجے طے کرائے۔ وہ بھی ایک لڑکے پر فدا ہوئے، لیکن وہ لڑکا اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا اور علی متقی، امان اللہ کو ایک ہفتے کا مراقبہ کرنے کے لیے کہا گیا، تو وہ لڑکا خود اس عمل سے ان کے پاس چل کر آیا، پھر پیر متقی ان کو الگ باتیں کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

دہلی میں دو بازار ''چاندنی چوک'' اور ''چوک سعد اللہ خان'' سارے شہر کی جان تھی۔ دلی کی جامع مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔اس کی سیڑھیوں پر کباب، تکے، انڈے، مرغی، تیتر، بٹیر بیچنے والے ہوتے تھے۔سینکڑوں باغات، خوبصورت عمارتیں، شہرِ پناہ، فقرا کے تکیے، سرائیں جابجا ملتی تھیں۔شہروں کی سڑکیں چوڑی تھیں، گلیوں میں اینٹوں کا فرش ہوتا تھا۔گندہ پانی جمع کرنے کے لیے جگہ جگہ ''چاہ بچے'' بنے ہوئے تھے۔محلوں کے نام پیشہ وروں کے لحاظ سے تھے، چوڑی والان، سوئی والان، چرخے والان، بلی ماران اس کی چند مثالیں ہیں۔ عمارتیں زیادہ تر دو منزلہ تھیں۔ امرا کی ڈیوڑھیوں میں عموماً نوبت خانے ہوتے تھے، بعض ڈیوڑھیوں میں گڑھیال لگے ہوئے تھے جو ہر تین گھنٹے کے بعد بجائے جاتے تھے۔جس سے پہر گذرنے کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہر امیر کے ساتھ پیدل اور سوار فوج رہتی تھی۔ امیروں کی ڈیوڑھیوں میں کئی ملازم ہوتے تھے۔منشی، دیوان، محرر، متصدی، داروغہ، نسقچی، نقیب، برقنداز، چوکی دار، آفتابہ بردار، آبدار، خانساماں، فراش، مہاوت، سائیس، نعل بند، آہن گر، کتاب دار، خوش نویس، عرائض نویس، فوطہ دار، اتالیق وغیرہ۔اسی طرح حرم میں قلماقنیاں، آیائیں، کھلائیاں، دائیاں، اناّئیں ہوا کرتی تھیں۔

مدرسوں و خانقاہوں میں مدرسہ بازار خانم و شاہ کلیم اللہ کی خانقاہ، مدرسہ غازی الدین خان، شاہ فخر الدین دہلوی، مرزا مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر در، سعد اللہ گلشن کی خانقاہیں مرجع عام و خواص تھیں۔آزاد بلگرامی کے مطابق

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں معقول ومنقول تعلیم کا رواج عام تھا۔ میر کے زمانے میں طلبا کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ انہیں کسی ایک فن میں مہارت حاصل کرنی ہوتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا ہوتا تھا۔ مسجد، مدارس وخانقاہوں میں صبح کے وقت تعلیم دی جاتی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم نجوم، تاریخ، منطق، ریاضی، صرف، نحو، حکمت، بلاغت نصاب میں شامل ہوتا تھا۔ تعلیم وتعلم کے علاوہ طلبا کے کردار، اخلاق، تربیت اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی خوب توجہ دی جاتی تھی۔ نظم وضبط پر بھی اچھی توجہ دی جاتی، اس کی برخلافی پر سزا بھی ملتی تھی۔ رہائش کے لیے دارالاقامہ ہوا کرتے تھے۔

ادبی مجالس ومشاعروں کے حوالے سے میر کا دور اردو کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ ان مجالس میں آداب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اوران میں بوڑھے، جوان، بچے ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ یہ مشاعرے عام طور پر عصر اور مغرب کے درمیان ہوا کرتے تھے۔ مجموعہ نغز کے مطابق میر ہر ماہ کی پندھوریں اور میر دردؔ تیسویں تاریخ کو اپنے گھر پر مشاعرہ کرتے تھے۔ نوے فیصد سلاطین اور اہلِ شہر صاحبانِ تخلص تھے، ان میں بھی بیشتر صاحبِ دیوان تھے، لہٰذا مشاعروں کی کثرت تھی اور طرحی مشاعرے بھی ہوتے تھے جن میں اظہارِ کمال کے لیے مشکل زمینیں رکھی جاتی تھیں۔ میر کے معاصرین میں سودا، حاتم، درد، مظہرِ جانِ جاناں، شیخ علی حزیں، آرزو، قزلباش خاں امید، شرف الدین مضمون، میاں ولی، محمد شاکر ناجی، اشرف علی خان پیام، محمد حسین کلیم، سعادت علی سعادت، میر سجاد، علی خان حشمت، کرم اللہ خان درد، امیر خان انجام، مرزا گرامی، سودا، درد، مصحفی وغیرہ ان مجالس کی رونق ہوا کرتے تھے۔ اسی دور میں ہمیں کئی تذکرے بھی ملتے ہیں جن میں نکات الشعرا، مخزنِ نکات، شورش، مسرت افزا، ریاض الفصحا، گلزارِ ابراہیم، طبقات الشعرا، مجموعہ نغز بہت اہم ہیں۔ اس زمانے کے رہن سہن میں ہند ایرانی / آریائی یا مغل تہذیب کا امتزاج تھا۔ جس کا معیاری نمونہ اشراف اور قلعے کے سلاطین تھے۔ ظاہری آداب کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ عمر وعلم کا لحاظ بھی رکھا جاتا تھا۔ خوشحال زیدی کا کہنا ہے کہ ''اس دور کے ذہن کو آسانی سے محمد شاہی ذہن اور طرزِ معاشرت کو محمد شاہی طرزِ معاشرت کہہ سکتے ہیں۔'' ظ انصاری کے بقول ''میر خود اس کلچر کا مظہر بن جاتا ہے۔ میر کی نظر اسرار پر اور ہماری نظر میر پر ہے لہٰذا میر ایک شخص یا شاعر نہیں بلکہ پورا ایک کلچر ہے۔'' اور دلی گویا اٹھارویں صدی کے اس تہذیبی ماحول کی علامت ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا ایک خاص ہند ایرانی مزاج بنایا تھا اور ایک نئی تہذیب وضع کی تھی۔

عزیز طلبا! یہ میر کے زمانے کی تہذیبی صورت حال کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جس سے ہمیں اس عہد کو سمجھنے اور اس کی وساطت سے میر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

1.3.4 ماحصل

عزیز طلبا! اس سبق میں ہم نے یہ جانا کہ کس طرح مغلیہ سلطنت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد بکھر کر زوال کا شکار ہوگئی اور اس کی وجہ سے ان کی قائم کردہ تقریباً دو سو سالہ روایات قصۂ پارینہ ہوگئیں۔ ان کے

جانشین پست ہمتی کے مرض میں مبتلا ہوکر تخت وتاج اور ملک وملت کے معاملات کوسرانجام دینے کے بجائے ناچ ونغمے میں مصروف ہوگئے یہاں تک شاہانِ انگریز کے دستِ نگر ایک کمپنی نے ان کی بادشاہت کا ہمیشہ کے لیے صفایا کردیا۔ جیسے جیسے انگریزی اقتدار بڑھتا اور پھیلتا جارہا تھا ویسے ویسے لوٹ کھسوٹ اور بدحالی بھی پھیلتی جارہی تھی۔ خزانہ خالی تھا، تجارت بحران کا شکار ہورہی تھی، جس کی وجہ سے دست کار، ہنرمند اور کاریگر پریشان حال ہورہے تھے۔ کسان کے لیے پیٹ پالنا اور محصول ادا کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا، ذرائع پیداوار ناکارہ ہوتا جارہا تھا۔ ملی اور مذہبی وفاداریاں خودغرضی کا شکار ہوگئیں۔ ابتذال نے شائستگی کی جگہ لے لی اور اخلاقی قدریں بے وقعت ہوگئیں۔ قہقہے، رنگ رلیاں، جنسی بداطواریاں، شراب نوشی، چراغاں، سیروتفریح، لذیذ غذائیں کھانا، شوخ اور بھڑکیلے لباس زیب تن کرنا، رات دن آرائش میں مشغول رہنا اس دور کے معاشرے کی عام روش تھی۔ ان ناسازگار سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا اثر جہاں ہندوستان کے تمام باشندوں پر مرتب ہوا وہیں ادب کو بھی ان نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ لہٰذا میر تقی میؔر اور ان کے معاصرین شعرا اور ادبا کو بھی انتشار پذیر ماحول سے متاثر ہوکر در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ جس کی صاف دستک اس عہد کی شاعری بالخصوص میر کے یہاں نظر آتی ہے۔

1.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میؔر کے عہد کی سیاسی صورت حال کے اہم واقعات سے واقفیت حاصل کی۔
- میؔر کے عہد کی سماجی صورتِ حال کے نمایاں اور غالب پہلوؤں کا ادراک کیا۔
- میؔر کے عہد کی تہذیبی صورت حال اور معاشرتی تناظرات کا نقشہ سمجھا۔
- میؔر کے عہد کے ارتقا اور زوال کے بنیادی محرکات واسباب سے آگہی حاصل کی۔
- عہدِ میؔر کی صورت حال سے باخبر ہوکر میر کی شاعری کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی۔

1.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میؔر نے کتنی جنگوں میں شرکت کی؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

۲۔ تہذیب کسے کہتے ہیں اور اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اختصاراً واضح کیجیے۔

۳۔ عہدِ میؔر میں بچے کی پیدائش کے وقت ہونے والی اہم رسموں کو بیان کیجیے۔

۴۔ عہد میؔر میں شادی کی رسوم کا مختصراً ذکر کیجیے۔

۵۔ میؔر کے دور میں پائی جانے والی نمایاں توہم پرستی کی نشان دہی کیجیے؟

1.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میرؔ نے کئی جنگوں میں شرکت کی ہے، مثلاً: ۱۷۴۸ء میں وہ رعایت خان کے ساتھ جنگ میں گئے جہاں مغل فوج کا مقابلہ احمد شاہ ابدالی کی فوج سے ہوا۔ اسی طرح پشکر راجستھان کی مہم میں بھی وہ ان کے ساتھ گئے۔ ایک مرتبہ اس وقت گئے جب صفدر جنگ نے احمد خان بنگش پر چڑھائی کی تو اسحاق خان نجم الالدولہ کے ساتھ فرخ آباد تک گئے۔ ۱۷۷۱ء میں وہ جنگِ سکرتال میں بھی شریک تھے۔

۲۔ فرد تنہا آدمی/ انسان کو کہتے ہیں۔ جب یہ افراد آپسی ضرورتوں کے لیے باہم ہوتے ہیں تو وہی سماج بن جاتا ہے۔ سماج یا معاشرے کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لیے قوانین بنائے جاتے ہیں، یوں ہمارے سامنے ایک منظّم سماج/ سوسائٹی جنم لیتی ہے۔ جب ایک طویل زمانے تک سماج کے یہ افراد روایتی خطوط کے مطابق زندگی گزارتے ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے تو ان کے اس طریق کار اور عمل کو کلچر/ ثقافت کہا جاسکتا ہے۔ یعنی رہن سہن، بود و باش، کھانا پینا، شادی بیاہ، مرگ و وفات، کھیتی باڑی وغیرہ۔ اسی لیے کلچر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''یہ کسی بھی سماج/ علاقے کا کلی طور پر زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ آرنالڈ ٹائن بی کے نزدیک ثقافت/ کلچر میں مذہبی اور اخلاقی عنصر لازمہ ہے۔ تہذیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا تحریر اور دھات کی ایجاد سے ہوئی۔ تاریخ کی ابتدا جیسے تحریر کے آغاز سے ہوئی ہے اسی طرح تہذیب کی بھی یہیں سے سمجھنی چاہیے۔'' کچھ محققین کی رائے ہے کہ تہذیب کی بنیاد سماجی/ عوامی تنظیم پر ہے۔ جس کی مثالیں شہر، اور ضلعوں میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے گاؤں/ دیہات کے برعکس شہری لوگوں کو مہذب سمجھا جاتا ہے۔ ''تہذیب کے معنی ذہنی نشو و نما اور ارتقا کے ہیں۔'' یہ دراصل اجتماعی طور پر زندگی گزارنے کا نام ہے۔

۳۔ عہد میر میں بچے کی پیدائش کے وقت کان میں تکبیر کہنا۔ چھٹے یا ساتویں دن عقیقہ کرنا، بال مونڈھنا، بالوں کے وزن کے برابر سونا یا چاندی صدقہ کرنا۔ بچے کا نام تجویز کیا جانا۔ پانچویں سال رسم بسم اللہ ادا کرنا، وغیرہ اہم رسمیں تھیں۔

۴۔ عہدِ میر میں شادیاں بڑے دھوم دھام سے کی جاتی تھیں۔ اس وقت کی شادیاں تین رسموں ساچق، مہندی اور بارات پر مبنی ہوتی تھی۔ تیل چڑھانا، ہاتھ میں کنگن یعنی شادی کے ڈورے کو پہنانا، سہرا باندھنا، اور دولہا کے جوڑوں کا دولھن کے گھر سے آنے کی رسمیں تھیں۔ بارات کی روانگی کے ساتھ آتش بازی کثرت سے چھوڑی جاتی تھی۔ برات کا دولھن کے گھر پر پہنچنے کے وقت دِھنگانا کی رسم بھی عام تھی۔ رخصتی کے وقت دولھن یا دولھے کے بڑے بھائی دولھن کو اپنی گود میں اٹھا کر چنڈول میں بٹھاتا تھا۔ اس پر پیسے نچھاور کیے جاتے تھے۔

۵۔ میر کے دور کی نمایاں توہم پرستیوں میں بزرگوں کے مزاروں پر عرس کرنا، چھڑیاں اور جھنڈے گاڑنا، جلوس نکالنا، ہر بڑے خاندان سے کسی نہ کسی نجومی کا وابستہ ہونا۔ ماہِ صفر کے تیرہ دن کو منحوس سمجھنا۔ عورتوں میں چیچک کی وبا پھیلنے پر دررواز ے پر آم کے پتے لٹکانا، لڑکوں کے سروں پر شاہ مدار اور دوسرے بزرگوں کے نام کی چوٹیاں رکھنا۔ جن یا بھوت کے اثرات سے خلاصی کے لیے مٹھائی تقسیم کرنا یا جانور بھینٹ کرنا، تعویذ لٹکانا، گنڈے پہننا، ٹونے ٹوٹکوں سے مسائل کا حل کرنا، فال اور شگون پر عقیدہ رکھنا، نظرِ بد سے بچنے کے لیے ماتھے پر کالے ٹیکے لگانا، نچھاورا تارنا۔ خواجہ خضر کی کشتی پر یقین رکھنا۔ حضرت قطب الاقطاب کی درگاہ کا طواف کرنا۔ نصیرالدین چراغ کی مزار کی اتوار کو زیارت کرنا، قابل ذکر ہیں۔

1.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
اتالیق	:	نقل وحرکت کا نگراں، تربیت دینے والا، معلم، استاد
بانک	:	معاہدہ، رضامندی، موقع محل، اتفاق
بانکا	:	جھکا ہوا، خم دار، ٹیڑھا، ترچھا
بُلاق	:	ناک میں پہننے کا زیور
بنوٹ	:	سپہ گری کے ایک فن کا نام
بھڑوا	:	بے شرم کمینہ، ذلیل، عورت کی بدکاری پر زندگی بسر کرنے والا
بھگت بازی	:	لڑکوں کو ناچنے گانے اور سوانگ بھرنے کی تعلیم دینے والا
جرہ باش	:	جھوٹا یا گڑھا ہوا احوال بیان کرنے والا
جل بانک	:	گہرے پانی میں دشمن سے مقابلہ کرنا
چنڈول	:	ایک قسم کی پالکی جسے کہار کندھے پر اٹھاتے ہیں
خانساماں	:	داروغہ، مہتمم، کھانا پکانے والا، خدمت گار
خواجہ سرا	:	غلام، نامرد، ہجڑا، مخنّث، وہ افسر جو شاہی محلات کا انچارج ہو
دچھنا	:	دلھن کے عزیزوں کو بطور عطیہ دیا جانے والا انعام، معاوضہ، نذرانہ
ساچق	:	دلہن کا لباس اور شیرینی تیل پھلیل وغیرہ جو شادی سے ایک روز پہلے دولھا کی طرف سے دلہن کے گھر بھیجی جاتی ہیں
سائیس	:	گھوڑے کی خِدمت کرنے والا
سِفلا	:	ناتجربہ کار، نچلے درجہ کا
متمکن	:	جگہ پکڑنے والا، جاگزیں، قائم، مقیم

مہاوت	:	ہاتھی چلانے والا، ہاتھی کی رکھوالی کرنے والا، فیل بان، فوجدار
ناگل	:	ہل، جوئے کی رسّی، جس سے بیل جوڑتے ہیں
نعل بند	:	نعل باندھنے کا کام کرنے والا، نعل لگانے والا

1.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	تاریخِ ادبِ اردو	:	ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔	مغل تہذیب	:	محبوب اللہ مجیب
۳۔	اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت	:	محمد عمر
۴۔	ذکر میر	:	میر تقی میرؔ
۵۔	دلی کی تہذیب	:	انتظار مرزا

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 2 عہدِ میرؔ کا شعری منظر نامہ

ساخت

2.1 اغراض ومقاصد
2.2 تمہید
2.3 عہدِ میرؔ کا شعری منظر نامہ
2.3.1 عہدِ میرؔ کا شعری رجحان
2.3.2 عہدِ میرؔ میں ہندی شاعری
2.3.3 عہدِ میرؔ کی زبان
2.3.4 ماحصل
2.4 آپ نے کیا سیکھا؟
2.5 اپنا امتحان خود لیجیے
2.6 سوالوں کے جوابات
2.7 فرہنگ
2.8 کتب برائے مطالعہ

2.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- عہدِ میرؔ کے شعری تصورات اور رجحانات سے متعارف ہوں گے۔
- عہدِ میرؔ کے شعری محرکات کے بنیادی اسباب وعلل سے روشناس ہوں گے۔
- عہدِ میرؔ کے شعری منظر نامے کی اہمیت وافادیت سے واقف ہوں گے۔
- عہدِ میرؔ کے شعری منظر نامے کی معنویت سے باخبر ہوں۔
- عہدِ میرؔ میں زبان وادب کا تہذیب وثقافت کی تعمیر میں کیا کردار رہا ہے؟ سے واقفیت ہوں گے۔

2.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر تقی میرؔ کے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا تفصیلی مطالعہ

کیا، جس سے آپ کو یہ خوبی علم ہوا کہ میر کا عہد دراصل سیاسی لحاظ سے انتشار پذیر تھا، جس میں سماجی نظام انہدامی کیفیت سے دوچار تھا۔ معاشرے میں امن وامان قائم نہ رہنے کی وجہ سے ادبا اور شعرا دربدری پر مجبور تھے۔ اب آپ زیرنظر اکائی میں ''عہد میر کا شعری منظر نامہ'' کے عنوان سے اس عہد کی ادبی صورت حال کا جائزہ لیں گے۔ چوں کہ عہد اپنے رجحانات، تصورات اور امتیازات سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے اس دور کے شعری منظر نامے کو سمجھے بغیر میر تقی میر کو سمجھا نہیں جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس اکائی میں آپ میر کے عہد کی زبان، شعری خصوصیات اور ادبی رجحانات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے، جس سے میر کی شاعری کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

2.3 عہدِ میرؔ کا شعری منظرنامہ

2.3.1 عہدِ میرؔ کا شعری رجحان

ایہام گوئی میر کے دور کا ایک اہم شعری رجحان تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں اردو شاعری، اس ایہام گوئی اور اسی قبیل کی دوسری مشقیات جیسے ضلع جگت، پھکڑ پن، رکاکت، ابتذال، جنسی اپچ، عامیانہ مضامین، قافیہ پیمائی کے نتیجے میں حقیقی فن کاری اور فن شناسی کے معنوں میں شاعری کم رہ گئی تھی اور الفاظ کی مشق زیادہ ہوگئی تھی۔ اگرچہ شعرا نے اپنے کمالِ فن کے مظاہرے دکھائے لیکن یہ شاعری حقیقی معنی میں شاعری نہیں تھی۔ جمیل جالبی کے مطابق ایہام گوئی اس دور کی تہذیبی فضا کی کوکھ سے پیدا ہوئی اور محمد شاہی دور سے پوری طرح ہم آہنگ ہوگئی۔ اس دور کی ساری زندگی خود ایہام کا درجہ رکھتی تھی، کیوں کہ ہر چیز اور ہر عمل ذو معنی ہوگئے تھے۔ اس دور میں بادشاہ اور رعایا ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے۔ یعنی جیسے راجا ویسی پرجا، لوگوں کی اکثریت مست مے عیش تھی۔ مثال سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ پہلے تلوار نبرد آزمائی کے کام آتی تھی اب وہ صرف دکھاوے کی ایک چیز بن گئی تھی۔ یعنی اس کا حقیقی مقصد فوت ہوگیا تھا گویا اب اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ اس تناظر میں جہاں تک متکلم کی بات ہے وہ اپنا مطلب واضح بھی کرنا چاہتا تھا اور چھپانا بھی چاہتا تھا، لہٰذا وہ ذو معنی الفاظ استعمال کرنے لگا۔ جس سے جاننے والے پر تو انکشاف ہوجائے اور انجان کے لیے وہ بات مخفی رہے۔ گویا مجازی و حقیقی معنی کو ملا کر صنعتِ ایہام کو مزے دار تخلیقی رجحان بنالیا گیا تھا۔ ظاہر و باطن، مزاج وطبیعت، شخصیت وذات میں دہرے پن نے ادب وشاعری میں بھی دہرے پن کو رواج دیا۔ اس کی وجہ سے جہاں شاعری میں حسن ومعنویت بڑھ گئی لیکن وہیں فن دست کاری کی سطح پر آکر زوال کے قریب بھی آگیا تھا۔ اس رجحان کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہوئے ہیں اہلِ زر خواہانِ دولت خوابِ غفلت میں
جسے سونا ہے یارو فرش پہ مخمل کے کہہ سوجا
(آبروؔ)

پہلے مصرعے میں صنعتِ ایہام کا استعمال اہلِ زر اور خواہانِ دولت میں ملتا ہے۔ دولت مند غفلت کی وجہ سے دولت کے خواہش مند ہوئے۔ دوسرے مصرعے میں صنعتِ ایہام کا استعمال لفظ سونا میں کیا گیا یعنی جس کے پاس سونا ہے وہ فرش کے مخمل پر سوتا ہے۔ یا یہ کہ ان کو دولت سمیٹنے دو اور خود سو جاؤ۔ یا جو سونا چاہے اس کو کہو کہ مخمل کے فرش پر سو جائے۔

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا
(آبروؔ)

اس میں لفظ 'پھر' میں ایہام ہے یعنی آبرو نے کہ کہا تھا کہ اس کی گلی میں نہ جاؤں، لیکن وہ اپنے قول سے پھر گیا، یا پھر اس کے کوچے میں گیا۔

تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے
(آبروؔ)

اس میں تجاہلِ عارفانہ کی صنعت استعمال کی گئی ہے جہاں کمر کو موہوم کہا گیا۔ ان اشعار میں شعرا نے ذو معنی الفاظ کے ساتھ ساتھ بہروپی طریقہ بھی اختیار کیا ہے۔

مذکورہ رجحان کے خلاف مرزا مظہرِ جانِ جاناں نے ''ردِ عمل تحریک'' جسے جمیل جالبی نے ''تازہ گوئی کے رواج کی تحریک'' سے موسوم کیا ہے، چلائی۔ اگر مرزا یہ تحریک نہ چلاتے تو اردو شاعری بہت پہلے اس رخ پر پہنچ گئی ہوتی جس کو بعد میں جدیدیت کے بینر تلے لکھنے والے بالخصوص راشد، میرا جی، افتخار عارف، محمد علوی، ندا فاضلی لے گئے اور اردو میر، غالب، امیر، جگر، اصغر، حسرت، اقبال، فیض، فراق، ناصر سے کچھ بعید نہیں محروم ہو جاتی۔ مرزا مظہرِ جانِ جاناں کا یہ بڑا کارنامہ تھا۔ احمد علی خان یکتا لکھتے ہیں کہ ''معنی کو قریب الفہم اس صفائی و سنجیدگی سے باندھنا کہ سننے والے کو کسی شرح یا لغت کی ضرورت نہ ہو اور قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی، وغیرہ ہر بات میں فارسی والوں کی پیروی کرنا'' یہ ردِ عمل کی تحریک کے اوصاف ہیں۔ مظہر جانِ جاناں کو اسی وجہ سے ریختہ کو فارسی طرز میں کہنے کا بانی کہا جاتا ہے۔ مظہر جانِ جاناں کے شاگرد انعام اللہ خاں یقین اور مصحفی کے بقول وہ شاعر ہیں جنہوں نے ایہام گوئیوں کے دور میں صاف و پاکیزہ ریختہ لکھا۔ ان کے بعد شاہ ظہور الدین حاتم نے بھی اسی روش کو اختیار کیا اور اپنا ''دیوان زادہ'' ترتیب دیا۔

اس دور میں شہر آشوب، واسوخت جیسی اصناف نے بھی اہمیت حاصل کی۔ شعرا نے اپنی ذات اور کائنات دونوں پر اپنے آنسو بہانے کے لیے انہوں نے دونوں اصناف کو استعمال کیا۔ اس کے علاوہ بھی مربع، مخمس جیسی ہیئتوں

سے بھی کام لیا گیا۔ اسلوب وہیئت کے لحاظ سے نظموں، تمثیلوں، مثنویوں، مرثیوں اور قصیدوں کا رواج بھی تھا۔ ریختی کا رجحان بھی اس دور کا اہم تجربہ تھا، لیکن غزل سب سے مرغوب صنف تھی۔ جو عشق و عاشقی کے مضامین کو فن کارانہ طور پر بیان کرنے کے لیے مشہور تھی۔ عشق کی توجیہ دو صورتوں میں کی گئی اول عشقِ حقیقی دوم عشقِ مجازی۔ تصوف کا زور عشقِ حقیقی پر تھا لہٰذا صوفیانہ شاعری میں عشقِ حقیقی بنیادی موضوع بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس صدی کی شاعری میں تصوف کا غالب رجحان رہا ہے اور شعرا نے تصوفانہ خیالات کو اپنی شاعری میں بہت جگہ دی ہے۔ ہمیں ''ذکر میر'' سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب درویشوں اور صوفیوں سے بہت متاثر تھے اور خرقِ عادات پر یقین رکھتے تھے۔ اس سے اس دور کے عام مزاج کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ تصوف میں بھی وحدت الوجود یعنی محی الدین ابن عربیؒ کے تصوارات کی زیادہ چھاپ تھی۔ خانقاہوں کی وجہ سے قوالوں کا بھی اس دور میں عام چلن تھا۔ محفلِ سماع میں ہر عام و خاص کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ وحدت الوجود، عرفانِ نفس، ناسوت و ملکوت، جبروت ولاہوت، فنافی اللہ، جبر وقدر، نورِ مطلق، خوف ورضا، حقیقت ومجاز، ظلِ الٰہی، تجددِ امثال، مشاہدہ وجدانی، مرتبۂ یقین اس دور کی اہم صوفیانہ اصطلاحات تھیں اور شاعری کی گویا غذا تھیں۔ تلمیحات میں جمشید وسکندر، شیریں وخسرو فرہاد، رستم وسہراب، لیلیٰ مجنوں، یوسفؑ وزلیخا، آبِ حیات، آئینۂ سکندر، سدِ سکندری، جامِ جم، مہ نخشب، دیوارِ چین، دار ومنصور، صبرِ ایوبؑ، گریۂ یعقوبؑ، برقِ تجلی، موسیٰؑ وطور، دمِ عیسیٰؑ سحرِ سامری، جوئے شیر، تیشۂ فرہاد، فغفورِ چین، گنجِ قارون، کوہِ قاف، کوہِ بے ستون، کوہ کن، اصحابِ کہف، گلزارِ خلیل، آتشِ نمرود، ماہِ کنعاں، تختِ سلیمانؑ، طوفانِ نوح، عدلِ نوشیرواں کا عام چلن تھا۔ حسن وعشق کے اظہار کے لیے جور وستم، وفا و جفا، غمزہ وادا، شکوہ وشکایت، اشک وآہ، گل وبلبل، جام وسبو، گریبان، دامن، ساقی، رشک، رقیب اور جنوں جیسی اصطلاحات اور لفظیات استعمال ہوتی تھیں۔ جام ومے، ساقی ومے خانہ، بت وبت خانہ، دیر وحرم، مسجد وکلیسا، تیغ وسنا، بہار وخزاں، عدو ورقیب، شمع وپروانہ، شاہ وگدا، زلف وگیسو، غمزہ وادا، تسبیح وزنار، زاہد وکافر، موج و حباب، بحر وناخدا، قاتل وصیاد، رہزن وراہ نما، کشتی وسفینہ، رقص وسرور، فراق ووصال رند خراباتی، پیرِ مغاں، اس دور کی بنیادی علامات ہیں۔ شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں کی کوششوں سے جدید محاورات بنائے گئے۔ تیغِ انتظار، عکسِ رخِ یار، حلقۂ کاکل، خیالِ عارضِ گلرنگ، زلفِ گرہ دار، محراب ابرو، بے تابی دل وغیرہ اس کی نادر مثالیں ہیں۔

اس دور کی شاعری میں ہمیں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جیسے کہ بہت سے شعرا میں شاعرانہ پختگی کی کمی کھٹکتی ہے۔ قواعد وعروض بھی ان کے یہاں ڈھیلے ڈھالے تھے۔ اشعار کی بندش بھی چست ہونے کے بجائے سست ہوتی تھی۔ تذکیر وتانیث واحد جمع کا فرق جہاں لکھنو و دہلی میں پایا جاتا تھا، وہیں ان شعرا کے ہاں بھی پایا جاتا تھا۔ اس میں شاعر کی اپنی صوابدید کام کرتی تھی۔ زبان میں شیرینی، صاف گوئی اور سادگی تو تھی، لیکن مشکل بحریں بھی اس دور کی شاعری میں داخل کی گئی تھیں۔ دوہرے قافیوں کا رواج ہوا تا کہ اپنی زبان دانی اور شعری

مہارت کی دھاک بٹھائی جائے۔

جہاں تک اس دور سے قدرے قدیم شعرا کی بات ہے تو ان میں فائز دہلوی کی شاعری میں حقیقت پسندی کے رجحانات نمایاں ہیں۔ وہ اپنے احساسات و جذبات کو شاعری کے قالب میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت سے عشق کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ وہ عورت اپنے رکھ رکھاؤ، چال ڈھال، لباس پوشاک سے نسوانی ہے۔ انہوں نے بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ کے برتنے سے بھی بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس دور کے رواج کے مطابق ہندی الفاظ کا عام استعمال بھی ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ حاتم نے فائز سے کچھ موضوعات مستعار لینے کے باوجود اپنی آواز کو انفرادی رنگ دینے کی کوشش کی۔ ہندی الفاظ کا استعمال انہوں نے فائز سے زیادہ کیا ہے اور اپنی زبان کو دیسی رنگ میں رکھنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ ان کی وجہ سے یہ دور ایہام گوئی کے لیے بھی جانا جانے لگا۔ ان کے یہاں فارسی اور ہندی کی ترکیبیں ملی ہوئی ہیں۔ شاکر ناجی نے اپنے دور کے لسانی اثرات کو کلی طور پر قبول نہیں کیا ہے، کئی ایک جگہ انہوں نے ذاتی اجتہاد سے بھی کام لیا ہے۔ انہوں نے ایہام گوئی کا بھی استعمال کم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے دور کی تصویر بھی اپنی شاعری میں کھینچی ہے۔ جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ''ناجی کی شاعری ایک پیشہ ور عشق باز کی شاعری ہے۔'' آبرو نے خوشی، سرشاری، کشادگی، قہقہہ اور فرحت کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے منطقی استدلال اور فلسفیانہ مضامین سے گریز کر کے عام حقائق کو بیان کیا ہے۔ میر کے ہم عصر سودا کی زبان سادہ، رواں اور ٹھیٹھ ہے۔ ہندی کے بجائے ان کے یہاں فارسی سے زیادہ استفادہ ملتا ہے اور فارسی الفاظ، محاورات اور تراکیب کو انہوں نے فن کارانہ طور پر برتا ہے۔ ان کی ایک اور خوبی بلند تخیل ہے۔ سوداؔ نے غزل کو اس کے لحاظ کے ساتھ برتنے کی کوشش کی لیکن قصیدہ گوئی کے اثر کی وجہ سے وہ اس میں دھیما پن، آہ، کسک جیسی کیفیات کو پیدا نہ کر سکے۔ حاتمؔ کی طرح انہوں نے بھی اپنے شہر آشوبوں میں اس دور کی طوائف الملوکی، اقتصادی و معاشی کمزوریوں، بدحالی، زبوں حالی اور بدانتظامیوں کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں۔ میر دردؔ کی شاعری صوفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ زبان و بیان کے لحاظ سے سہل انداز میں پیش کی گئی ہے۔ انہوں نے اس میں حد درجہ پستی و ابتذال سے گریز کر کے سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ میر دردؔ کے ہاں ہمیں ایک تفکر کا احساس ہوتا ہے۔ جس میں احساس فکر کے تابع ہے۔ بقول جمیل جالبی ''وہ شاعری میں فکری رجحان کے پیش رو ہیں۔ میر مجنون عاشق ہیں، درد باہوش عاشق ہیں۔'' میر و سودا و درد کے اس دور کو اردو شاعری کا زریں دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں میر نے ذاتی شاعر بننے کی کوشش یوں کی کہ اپنی ذات کا رونا رویا اور عوامی شاعری کے لحاظ سے دلی اور دل کے مرثیے لکھے:

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

بے تابانہ دل سوزی و دل سازی، عاشقانہ گدازی، رندانہ حالت، دلبرانہ ربودگی، حزنیہ کیفیت، المناک فضا، ذات کی خستگی، اظہار کی بے ساختگی میر کی شاعری کی وہ خصوصیت ہیں جنہوں نے اس عہد کے شعری منظر نامے کو مالا مال کر دیا اور اس عہد کو تمام عہدوں پر سبقت دلائی۔ میر کی شاعری میں ہمیں اپنے دکھوں کا مداوا ملتا ہے۔ میر پر جو بیتی ہے جب وہ اس کو بیان کرتے ہیں تو ہمیں یوں لگتا ہے کہ وہ ان پر نہیں بلکہ ہم پر بیتی ہے۔ گویا انہوں نے ہمارے ہی جذبات واحساسات کو زبان عطا کی ہے۔ ہم ان کو شعوری طور پر اندر ہی اندر محسوس کر رہے تھے مگر اظہارِ بیان سے قاصر تھے۔ میر نے اس کو بیان کر کے ہماری مشکلات کو دور کر دیا۔ اس لیے میر کی شاعرانہ خوبی یہ بن جاتی ہے کہ وہ ہمارے دکھ و درد میں شریک ہوتے ہیں یا ہم ان کو اپنے دکھ و درد میں شریک پاتے ہیں۔

آنکھوں سے جو حال پوچھا دل کا
اک بوند ٹپک پڑی لہو کی

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کر

تلازمات کی پہلوداری، تشبیہات واستعارات کی ندرت، حسیاتی تجسیم کاری، پیکر تراشی کے خوبصورت نمونے، نغمگی، علامتوں کا حسن، بلاغت کی تہہ داری، سامنے کی باتیں، گرے پڑے مضامین میں گہرائی پیدا کرنا میر کی شاعری کا خاصہ ہے۔

الغرض یہ کہ اس دور میں اردو شعرا نے فارسی شاعری کے مضامین کو اپنے جذبات واحساسات، مشاہدات و تجربات کی وساطت سے ایک نئے انداز سے برتنے کی کوشش کی۔ عوامی بول چال کی زبان کو معیاری سمجھا گیا۔ عوام کی ٹکسالی زبان ہونے کی وجہ سے اسلوب واظہار کا فطری میلان پروان چڑھا۔ بقول جمیل جالبی ''اس دور کی روح دو چیزوں پر جان دیتی ہے۔ ایسی بات جس سے مزا آجائے اور ذرا دیر کو طبیعت خوش ہو جائے یا پھر ایسی بات جس میں بے ثباتی دہر و بے وفائی زمانہ کا ذکر ہو۔'' ایک اور کوشش یہ بھی کی گئی کہ خیالی مضامین کے بجائے وارداتِ قلبی کے بیان پر زیادہ زور دیا گیا۔ ساتھ ہی بلند پروازی، نازک مزاجی، مبالغہ آرائی، معاملہ بندی، مضمون آفرینی، لطافتِ بیان، تمثیلی پیرایہ کے اظہارات بھی پروان چڑھتے رہے۔ نزاکت و نفاست، سوز و گداز،

دردو یاس، حسرت وملال، حسن ورنگینی، سلاست وصفائی کی مثالیں بھی اس دور کی شاعری میں کثرت سے ملتی ہیں۔ مفلسی، رندی، لاابالی پن، بے رغبتی، حال مستی، دردمندی، سپردگی، ربودگی، شائستگی، نرم خوئی، جذبے کا ارتکاز، رمزوایما، کچھ الفاظ سے کام لینے کا سلیقہ، انسان اور انسان کے باہمی رشتے کا وضاحت کا بیان اس دور کی شاعری کا خاصہ ہے۔

2.3.2 عہدِ میر میں ہندی شاعری

عہدِ میر میں ہندی شاعری ریتی کال کے نام سے مشہور تھی۔ ہندی کے ان شعرا کا غالب رجحان سنسکرت کے اچاریوں کے ذریعے شعری تخلیقات کے لیے مقرر کیے گئے اصولوں کی نقل کرنا تھا۔ اس میں ریتی کرم یعنی عملی تنقید جس میں شاعر النکاروں یعنی صنائع و بدائع اور لکشوں یعنی شعری محاسن کے ذریعے اشعار کی تشریح کرتا ہے۔ جسونت سنگھ یعقوب خان، رسِک مومتی، دلپتی رائے، ونشی دھر، گووند، رس روپ، چنتامنی، متی رام بھوشن داس، کل پتی، شری پتی، پدکر ما اور گوال ہندی زبان کے روایت پسند شاعر تھے۔ فارسی زبان کی شاعری کی وجہ سے خیال میں شدت، نزاکت، انفرادیت، حزن، داخلیت، صوفیانہ رنگ، مایوسی اور یک طرفہ محبت کا اظہار ریتی بودھ اور مکتی بودھ/ ریتی مکت دنوں میں در آئے تھے۔ انیس انصاری کے بقول اس دھارا کے شاعروں نے اپنی شاعری میں ذاتی شعری آدرشوں کا اظہار کیا ہے۔ دبستانِ دلی کے شعرا کی طرح ان کی شاعری جذبوں میں ڈوبی ہوئی ہے جس کی بدولت یہ داخلی شاعری بن گئی ہے۔ ان شعرا نے عشق کے تجربے کو اظہارِ ذات کے وسیلے کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں دردوحزن کی لے تیز ہے، وصل کا بیان سوزودرد سے لبریز ہے، یہی وجہ ہے کہ ذاتی عشق کی داستانِ غم کے دوران، سماجی اضطراب بھی ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ شاعری میں النکاروں کا استعمال دانستہ کے بجائے بے ساختہ اور جذبے کے اظہار کے طور پر ہوا ہے۔ ان کے تصورِ عشق میں بوالہوسی کے بجائے رفعت پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں یہ تصور جذباتی ہے، لہٰذا ناکامی کی صورت میں اس میں حسرتوں کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ انیس انصاری کے نزدیک ''میر اور ہندی کے ریتی مکت یا غیر روایتی شاعری کی فکر، اسلوب اور ادائیگی کے انداز میں بڑی مماثلت ہے۔'' جس کے اہم شاعر گھنانند، عالم، ٹھاکر، بودھا، دیوج دیو وغیرہ تھے۔ جب کہ ریتی بدھ شاعری میں دبستانِ لکھنو کی طرح عشق پاکیزہ نہیں ہے، اور ان کا اظہار بھی عریاں ہے۔ ان کے یہاں محبوب ظاہری شکل وصورت ہی کی وجہ سے اہم ہے۔ ہندی کے یہ الفاظ: اگنا، انجھوا، چرچ، برہ، پیار، پریت، جگ، تن، من، لاج، سکھ، جوت، دھرم، پگ، انکھیاں، رین، سریجن، سجن، کال، لگن، بلہاری، بھگت، پوجا، مکھ، سیتی، سیں، نمن، انتظاری، بوجھنا، آنجھو، کوں، ڈگ ڈگ، سانجھ، ہمن، جیو، نار، نس ادھر، چرن، بیاکل، اپوکن، ٹھور، اتر، انیک، جا گہہ بھیتر، مجارے، کاٹھ، کدو جیسے الفاظ کا اس دور میں عام چلن تھا۔

2.3.3 عہدِ میر کی زبان

میر کے زمانے میں ایرانی شاعروں کی ایک نئی کھیپ ہجرت کر کے دلی کی طرف آئی، ان کی آمد سے ہندوستان کے فارسی داں شعرا احساسِ کمتری کا شکار ہوئے۔ منیر لاہوری کو گلہ تھا کہ ''جس شاعر کی جائے پیدائش ایران نہیں ہوتی اس کی فصاحت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔'' شیدا کو شکوہ تھا کہ ''ہندوستانی ہونے کی بنا پر میری قدر نہیں کرتے۔'' حاکم لاہوری کے نزدیک شیخ محمد علی حزیں کے ''تذکرۃ الاحوال'' لکھنے کا مدعا و مقصد ہندوستانیوں کی مذمت ہے۔ جس کے جواب میں سراج الدین علی خان آرزو نے اپنا رسالہ ''تنبیہ الغافلین' لکھا اور یہاں کے شاعروں کو اپنی زبان میں شاعری کرنے کی ترغیب دی۔ اس زمانے میں فارسی کی کئی لغتیں تالیف کی گئیں۔ خان آرزو کی فارسی لغت ''چراغِ ہدایت'' اسی دور کی یادگار ہے۔ اسی دور میں مشاعرہ کے وزن پر ''مراختہ'' کا لفظ ایجاد کیا گیا اور خان آرزو ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو اپنے گھر پر محفلِ مراختہ کا اہتمام کراتے تھے۔ کچھ مدت بعد اشرف علی خان کے رسالے کے ساتھ اس دور کے نامور شاعر فاخر نے تصحیح کے بجائے تنقیص کی، جس پر مرزا محمد رفیع سودا نے اپنا رسالہ ''عبرت الغافلین' لکھا اور فاخر کی غلطیوں کو نشان زد کیا۔ اس کے بعد طرفین میں کئی بحثیں چلیں۔ لالہ ٹیک چند بہادر کی ''بہارِ عجم'' بھی فارسی کو نئے سرے سے جاننے کی ایک قابل قدر کوشش ہے۔ لالہ کا شوق یہ تھا کہ وہ ایرانی سپاہیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور ان سے فارسی کے جدید الفاظ و محاورات کے معنی دریافت کرتے تھے۔

اس دور میں فارسی کے جدید محاورات باندھنے میں خاص توجہ مرکوز کی جارہی تھی۔ اس دور میں مسجد کو مسجت، پلید کو پلیت، دست خط کو دسخط، شتاب کو شتابی، اضطراب کو اضطرابی، قرآن کو قران، امیری کو امرائی، خیال کو خال، نزدیک کو نزیک باندھا جارہا تھا ہے۔ یہ صرف میر تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس دور میں ایک رجحان کے تحت ہی ایسا ہورہا تھا۔ زبان اپنے اصول خود وضع کر رہی تھی۔ شاعری کے پہلے اور دوسرے دور میں ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔ تیسرے اور چوتھے دور میں ان کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ نے لے لی۔ سنسکرت، بھاشا اور قدیم دکنی الفاظ کے اخراج کے بعد عربی فارسی الفاظ کو صحت کے ساتھ برتا جانے لگا۔ بہت سے بھدے اور سخت الفاظ کی کانٹ چھانٹ بھی ہوئی اور رفتہ رفتہ زبان، فارسی آمیز ہوتی چلی گئی۔ جب کہ بالعموم اس دور کی شاعری شام کی جگہ سانجھ، محبوب کی جگہ سجن، شہر کی جگہ نگر، چہرہ کی جگہ مکھ، خوشبو کی جگہ باس، دنیا کی جگہ جگ جیسے الفاظ رائج تھے۔ اسی طرح مٹی کی جگہ ماٹی، لگا کی جگہ لاگا، پھٹنا کی جگہ پھاٹنا، جگہ کی جگہ جاگھ، لہو کی جگہ لوہو، ڈبویا کی جگہ ڈبایا رائج تھے۔ اسی دور میں فارسی صنائع و بدائع کا استعمال بھی عام ہوا۔ مصوری میں سنہرے رنگوں اور جیتی جاگتی تصویروں کا چلن بھی ہوا۔ تشبیہوں و استعاروں میں غیر مقامی اور مقامی دونوں رنگوں کو اپنایا جانے لگا۔

عہدِ غالب تک فارسی تراکیب کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا بلکہ یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے۔ گویا کہ انگریزی کے اثر کی وجہ سے رفتار کچھ سست پڑی ہے۔ اس عہد میں سخت محاورات و تراکیب کی جگہ خوش نما محاورے و تراکیب لائیں گئیں، جس سے تحریر میں دلکشی و جاذبیت بڑھ گئی۔ اس عہد میں ہمیں ان تراکیب مثلاً ترا

آمدن: تر آ آنا، خوش آمدن: خوش آنا، گوش کردن: گوش کرنا، واشدن: وا ہونا، چشم دوختن: چشمِ سینا، قبیل کی تراکیب کا ترجمہ ملتا ہے۔ البتہ بہت سی فارسی تراکیب کو ان شعرا نے جوں توں برقرار رکھا ہے جو اردو کے مزاج میں رچ بس گئیں۔ جیسے: سبحہ گرداں، ستم کشتہ، غبارِ ناتواں، پروانہ ساں، عاجزِ سخن، حلقہ در گوش، ہنگامہ گرم کن، درائے قافلہ ساں، یک بیابان بے کسی و تنہائی جیسی تراکیب کلامِ میر میں بھی ملتی ہیں۔ اس کا اثر غالب کی شاعری پر بھی پڑا اور ان کی شاعری میں ایک مصرعہ فارسی نما اور دوسرا ریختہ نما ہوتا تھا۔ ایسے ہی تذکیر و تانیث کا معاملہ ہے کہ اس زمانے میں یہ الفاظ: اسیر، دید، جراحت، جان، سطح، گشت، گل گشت، خلش، سوت مذکر بولے جاتے تھے اور تغلب، خواب، گلزار، مزار، نشتر، حشر مؤنث بولے جاتے تھے۔ حالتِ ندا میں اور حروفِ مغیرہ کے ساتھ فارسی جمع لائے جاتے تھے مثلاً اے بتاں، اے ہم صفیراں، بتاں کا عشق۔ یعنی وہ ایسے لکھتے تھے'' آوارگاں کو بلبلاں نے موزوں طبعاں سے کہا۔'' صفت میں زیادتی کے اظہار کے لیے بہت کے بجائے زور لگاتے تھے، یعنی بہت مست کے بجائے زور مست، بہت بے قرار کے بجائے زور بے قرار لکھتے تھے۔ میر درد کا یہ شعر جس کی بہترین مثال ہے:

زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصہ مختصر دیکھا

(یعنی بہت عاشق مزاج اگر کوئی ہے تو وہ دردؔ ہے۔)

ضمیرِ شخصی واحد غائب حالتِ فاعل کو 'اس نے' کے ساتھ 'ان نے' اور وہ کی جمع 'وے' لکھتے تھے۔ اضافی حالت میں کس نے: کن نے، جس نے: جن نے حالتِ جمع میں جنہوں کا، کنہوں کا رائج تھا۔ تو، میرا، تیرا، کی جگہ مجھ، تجھ کہتے تھے۔ مثلاً مجھ عشق، تجھ صفت ''تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا'' (ولی) وغیرہ۔ اس زمانے میں فعلِ متعدی میں 'نے' کا لانا ضروری نہیں تھا۔ مثلاً میں نے شہر دیکھا، میں نے کام کیا، تم نے اس کو دیکھا کے بجائے میں شہر دیکھا، میں کام کیا، تم اس کو دیکھا لکھتے تھے۔ فعل کے جمع مؤنث غائب و متکلم کے صیغوں میں لاحقہ 'یں' کی جگہ 'اں' لگایا جاتا تھا۔ مثلاً عورتیں آئیں کی جگہ عورتیں آئیاں، کھانا لائیاں، زلفیں دکھلائیاں، باتیں نہ مانیاں وغیرہ لکھتے تھے۔ ترکیبِ اضافی میں ہندی لفظ کے ساتھ فارسی اضافت لانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جیسے مانندِ آرسی، پوششِ چھینٹ، صاحبِ ارتھی، بٹیرۂ پان۔ مرکبِ عطفی پر بھی فارسی اضافت لاتے تھے مثلاً جائے بود و باش۔ غرض یہ کہ آج یہ اردو زبان عہد بہ عہد تبدیلیوں کے کئی مراحل سے گزر کر ہم تک آئی ہے۔

2.3.4 ماحصل

عزیز طلبا! عہدِ میرؔ کے شعری منظر نامے کے مطالعے کے بعد ہمیں علم ہوا کہ ایہام گوئی میر کے دور کا ایک اہم

شعری رجحان تھا۔ مجازی وحقیقی معنی کو ملا کر اس دور کے شعرا نے صنعتِ ایہام کو اپنا مزے دار تخلیقی رجحان بنا لیا تھا۔ اس رجحان کے خلاف مرزا مظہرؔ جانِ جاناںؒ نے ''ردِ عمل تحریک'' چلائی۔ اسی دور میں شہر آشوب اور واسوخت جیسی اصناف نے بھی اہمیت حاصل کی۔ مزید برآں مربع، مخمس جیسی ہیئتوں کے تجربات بھی کیے گئے۔ میر کے زمانے میں ایرانی شاعروں کی ایک نئی کھیپ ہجرت کر کے دلی کی طرف آئی تھی، ان کی آمد کی وجہ سے ہندوستان کے فارسی داں شعرا احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے تھے۔ سراج الدین علی خان آرزو نے اپنے رسالے ''تنبیہ الغافلین'' میں یہاں کے شاعروں کو اپنی زبان میں شاعری کرنے کی ترغیب دی۔ شاعری کے پہلے اور دوسرے دور میں ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔ تیسرے اور چوتھے دور میں ان کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ نے لے لی اور رفتہ رفتہ زبان، فارسی آمیز ہوتی چلی گئی۔ اس دور میں بہت سے بھدے اور سخت الفاظ کی کانٹ چھانٹ ہوئی۔ ان کی جگہ عربی فارسی کے الفاظ استعمال میں لائے گئے۔ سخت محاورات وتراکیب کی جگہ خوش نما محاورے وتراکیب لائیں گئیں۔ جس سے تحریر میں دلکشی وجاذبیت بڑھ گئی۔ خیالی مضامین کے بجائے وارداتِ قلبی کے بیان پر زیادہ زور دیا گیا۔ ساتھ ہی بلند پروازی، نازک مزاجی، مبالغہ آرائی، معاملہ بندی، مضمون آفرینی، لطافتِ بیان، تمثیلی پیرایہ کے اظہارات بھی پروان چڑھتے رہے۔ عہدِ میر میں ہندی کے شعرا کا غالب رجحان سنسکرت کے اچاریوں کے ذریعے شعری تخلیقات کے لیے مقرر کیے گئے اصولوں کی نقل کرنا تھا۔ میر اور ہندی کے ریتی مکت یا غیر روایتی شاعری کی فکر، اسلوب اور ادائیگی کے انداز میں بڑی مماثلت تھی۔ الغرض یہ کہ اس دور کو اردو شاعری کا زریں دور کہا جاتا ہے۔

2.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- عہدِ میرؔ کے شعری منظرنامے سے واقفیت حاصل کی۔
- عہدِ میرؔ کی زبان یعنی واحد جمع، مذکر مؤنث، حرفِ مغیرہ، ضمائر، اسما، افعال وغیرہ قواعد کا علم حاصل کیا۔
- عہدِ میرؔ کی ہندی شاعری ریتی کال، ریتی بودھ، ریتی مکت کے بارے میں معلومات حاصل کی۔
- عہدِ میرؔ کے شعری تجربات، خصوصیات اور امتیازات کی جانکاری حاصل کی۔
- عہدِ میرؔ کے شعری مزاج، تصورات اور امکانات کا ادراک کیا۔

2.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ ہندوستان کے فارسی شعرا کا ایران کے شعرا سے کیا گلہ تھا؟ واضح کیجیے۔

۲۔ عہدِ میرؔ میں زبان کے رائج قواعد بیان کیجیے۔

۳۔ عہدِ میرؔ کی ہندی شاعری کی خصوصیات مختصراً بیان کیجیے۔

۴۔ ایہام گوئی کے خلاف تحریک کس نے چلائی اور اس کے اوصاف کیا کیا ہیں؟ بیان کیجیے۔

۵۔ رسالہ ''تذکرۃ الاحوال'' لکھنے کا مقصد کیا تھا اور اس کے جواب میں کس رسالہ کو تحریر کیا گیا؟

2.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میرؔ کے زمانے میں ایرانی شاعروں کی ایک نئی کھیپ ہجرت کر کے دلی کی طرف آئی، ان کی آمد سے ہندوستان کے فارسی داں شعرا احساسِ کمتری کا شکار ہوئے۔ منیر لاہوری کو گلہ تھا کہ ''جس شاعر کی جائے پیدائش ایران نہیں ہوتی اس کی فصاحت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔'' شیدا کو شکوہ تھا کہ 'ہندوستانی ہونے کی بنا پر میری قدر نہیں کرتے۔' حاکم لاہوری کے نزدیک شیخ محمد علی حزیں کے ''تذکرۃ الاحوال'' لکھنے کا مدعا و مقصد ہندوستانیوں کی مذمت ہے۔

۲۔ عہدِ میرؔ میں زبان کے جو قواعد رائج تھے وہ یہ ہیں مثلاً: ضمیرِ شخصی واحد غائب حالتِ فاعل کو 'اس نے' کے ساتھ 'ان نے' اور وہ کی جمع 'وے' لکھتے تھے۔ اضافی حالت میں کس نے کو کن نے، جس نے کو جن نے، حالت جمع میں جنہوں کا، کنہوں کا رائج تھا۔ تو، میرا، تیرا، کی جگہ مجھ، تجھ کہتے تھے۔ مثلاً مجھ عشق، تجھ صفت وغیرہ۔ اس زمانے میں فعلِ متعدی میں 'نے' کا لانا ضروری نہیں تھا۔ مثلاً میں نے شہر دیکھا، میں نے کام کیا، تم نے اس کو دیکھا کے بجائے میں شہر دیکھا، میں کام کیا، تم اس کو دیکھا لکھتے تھے۔ فعل کی جمع مؤنث غائب و متکلم کے صیغوں میں لاحقہ 'یں' کی جگہ 'اں' لگایا جاتا تھا۔ مثلاً عورتیں آئیں کی جگہ عورتیں آئیاں، کھانا لائیاں، زلفیں دکھلائیاں، باتیں نہ مانیاں وغیرہ لکھا جاتا تھا۔ ترکیبِ اضافی میں ہندی لفظ کے ساتھ فارسی اضافت لانے میں کوئی حرج نہ سمجھا جاتا۔ جیسے مانندِ آرسی، پوشش چھینٹ، صاحبِ ارتھی، بٹیرہ پان۔ مرکبِ عطفی پر بھی فارسی اضافت لائی جاتی تھی مثلاً جائے بود و باش۔

۳۔ عہدِ میرؔ میں ہندی شاعری ریتی کال کے نام سے مشہور تھی۔ ہندی کے ان شعرا کا غالب رجحان سنسکرت کے اچاریوں کے ذریعے شعری تخلیقات کے لیے مقرر کیے گئے اصولوں کی نقل کرنا تھا۔ اس میں ریتی کرم یعنی عملی تنقید جس میں شاعر النکاروں یعنی صنائع و بدائع اور لکشوں یعنی شعری محاسن کے ذریعے اشعار کی تشریح کرتا ہے۔ فارسی زبان کی شاعری کے زیر اثر خیال میں شدت، نزاکت، انفرادیت، حزن، داخلیت، صوفیانہ رنگ، مایوسی اور یک طرفہ محبت کا اظہار ریتی بودھ اور مکتی بودھ/ ریتی مکت بھی برتا جانے لگا تھا۔ ہندی شاعری میں النکاروں کا استعمال دانستہ کے بجائے بے ساختہ اور جذبے کے اظہار کے طور پر کیا جانے لگا تھا۔

۴۔ ایہام گوئی کے رجحان کے خلاف مرزا مظہرِ جانِ جاناں نے ''ردِعمل تحریک'' جسے جمیل جالبی نے ''تازہ گوئی کے رواج کی تحریک'' سے موسوم کیا ہے، چلائی۔ اگر مرزا یہ تحریک نہ چلاتے تو اردو شاعری بہت پہلے اس رخ پر پہنچ گئی ہوتی جس کو بعد میں جدیدیت کے بینر تلے لکھنے والے بالخصوص راشد، میراجی، افتخار عارف، محمد علوی، ندا فاضلی لے گئے اور اردو میر، غالب، امیر، جگر، اصغر، حسرت، اقبال، فیض، فراق، ناصر سے کچھ بعید نہیں محروم ہو جاتی۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کا یہ بڑا کارنامہ تھا۔ احمد علی خان یکتا لکھتے ہیں کہ ''معنی کو قریب الفہم اس صفائی و سنجیدگی سے باندھنا کہ سننے والے کو کسی شرح یا لغت کی ضرورت نہ ہو اور قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی، وغیرہ ہر بات میں فارسی والوں کی پیروی کرنا'' یہ ردِعمل کی تحریک کے اوصاف ہیں۔

۵۔ شیخ محمد علی حزیں کے ''تذکرۃ الاحوال'' لکھنے کا مدعا و مقصد ہندوستانیوں کی مذمت ہے۔ جس کے جواب میں سراج الدین علی خان آرزو نے اپنا رسالہ ''تنبیہ الغافلین' لکھا اور یہاں کے شاعروں کو اپنی زبان میں شاعری کرنے کی ترغیب دی۔

2.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
آئینۂ سکندر	:	وہ آئینہ جس کی ایجاد سکندر سے منسوب ہے
اسالیب	:	اسلوب کی جمع، طور طریقے، رسومات
بے ساختگی	:	سادگی، بناوٹ نہ ہونا، بھولپن
پھکڑ پن	:	فحش گوئی، ہزل
تغلب	:	غلبہ، تسلط، مغلوب کرنا، غبن، خیانت
تلازمہ	:	مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال جو صنعتِ شعری میں داخل ہو
ٹھیٹھ	:	خالص، اصل کے مطابق
جامِ جم	:	ایران کے بادشاہ جمشید کا پیالہ جس پر بندسی خطوط اور شکلیں بنی ہوئی تھیں
جبروت	:	قدرت، طاقت، حشمت، عظمت، بزرگی، جلال۔ تشدّد، سخت گیری

چاہِ نخشب	:	نخشب کا کنواں
حزنیہ کیفیت	:	غم انگیز واقعہ، المیہ کیفیت
خستگی	:	زخمی یا مجروح ہونے کی حالت، خستہ پن، ٹوٹ پھوٹ، کاٹ چھانٹ
خصائص	:	خاصیتیں، عادات، خوبیاں، صفات
دل سازی	:	خوشی، فرحت، خوش کرنا، اشتیاق، لگن
دل سوزی	:	دردمندی، ہمدردی، جاں گدازی، غم ناکی
رُبُودگی	:	اپنی طرف کھینچ لینے اور جذب کرنے کی کیفیت
رکاکت	:	چھچھورپن، بارِ آدمیت، سفلہ پن، کمینگی، رذالت
سدِ سکندری	:	وہ دِیوار جو ذوالقرنین یا سِکندر نے یاجوج و ماجوج کو روکنے کے لیے بنائی تھی
شہر آشوب	:	وہ نظم جس میں کسی شہر یا ملک کی اقتصادی یا سیاسی بے چینی کا تذکرہ ہو
ظلِ الٰہی	:	خدا کا سایہ، مجازاً بادشاہ
عرفانِ نفس	:	عرفان ذات، خود آگاہی
فغفورِ چین	:	چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب
لاہوت	:	عالم ذات الٰہی جس میں سالک کو فنافی اللہ کا مقام حاصل ہوتا ہے
مست مئے عیش	:	عیش کی شراب کے نشے میں چور

2.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ آبِ حیات : مولانا محمد حسین آزاد

۲۔ میر تقی میرؔ اور ان کی ہم عصر شاعری : انیس انصاری

۳۔ تاریخِ ادبِ اردو (جلد دوم) : ڈاکٹر جمیل جالبی

۴۔	عہدِ میرؔ کی زبان	:	وحید الدین سلیم
۵۔	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر (عہدِ میر تک)	:	محمد حسن

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 3 میرؔ کے سوانحی حالات وکوائف

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 میرؔ کے سوانحی حالات وکوائف

3.3.1 میرؔ کے آباواجداد

3.3.2 میرؔ کی پیدائش،تعلیم اورازدواجی زندگی

3.3.3 میرؔ کی ملازمت اوراسفار

3.3.4 میرؔ کی شخصیت

3.3.5 ماحصل

3.4 آپ نے کیاسیکھا؟

3.5 اپناامتحان خودلیجیے

3.6 سوالوں کے جوابات

3.7 فرہنگ

3.8 کتب برائے مطالعہ

3.1 اغراض ومقاصد

عزیزطلبا!اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کے آباواجداد کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- میرؔ کی پیدائش،تعلیم وتربیت اوران کی شخصیت سازی سے روشناس ہوں گے۔
- میرؔ کی ازدواجی اورعملی زندگی سے واقف ہوں گے۔
- بادشاہوں اورنوابوں کے ساتھ میر کے مراسم کوسمجھیں گے۔
- میرؔ کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں سے متعارف ہوں گے۔

3.2 تمہید

عزیزطلبا! پچھلی دونوں اکائیوں میں آپ نے میر کے زمانے کی سیاسی،سماجی اورتہذیبی صورت حال اورشعری منظرنامہ کوسمجھنے کی کوشش کی۔دراصل وہ دونوں اکائیاں میر کے تفہیمی پس منظر کی حیثیت رکھتی ہیں۔یہ پس منظر

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میر کے فکر و فن کو سمجھنے میں حد درجے معاون ثابت ہوگا۔ لہٰذا اب آپ اس کے آگے کا مرحلہ طے کریں گے۔ یعنی زیرِ نظر اکائی میں میرؔ کے سوانحی حالات وکوائف کا مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعے میں آپ میر کے خاندان، پیدائش، تعلیم وتربیت، ازدواجی زندگی، ملازمت، مشاغل، اسفار اور ان کی شخصیت کے نمایاں حالات وواقعات سے سیر حاصل استفادہ کریں گے۔

3.3 میرؔ کے سوانحی حالات وکوائف

3.3.1 میرؔ کے آبا واجداد

''ذکرِ میر'' میں میر کا بیان ہے کہ میرے بزرگ حجاز سے رختِ سفر باندھ کے دکن کی سرحد پر پہنچ کے احمد آباد گجرات وارد ہوئے۔ لیکن ان کے جدِ کلاں نے اکبر آباد آگرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جو میر کے دادا تھے۔ وہ فوجداریِ گردِ اکبر آباد پر فائز ہوئے۔ پچاس سال کی عمر میں وہ کچھ بیمار پڑے تو اسی دوران انہیں گوالیار جانا پڑا، نقاہت کی وجہ سے راستے میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑا لڑکا ذہنی طور پر تندرست نہ تھا اور جوانی میں ہی انتقال کر گیا تھا، چھوٹے بیٹے کا نام محمد علی تھا اور علی متقی کے خطاب یا عرف سے جانے جاتے تھے۔ یہی علی متقی میر کے والد ماجد تھے۔ جو ۱۶۷۱ء کے قریب پیدا ہوئے اور ۱۷۳۳ء کے قریب وفات پائی۔ ان کی وفات کے وقت میرؔ ۱۱ یا ۱۲ برس کے تھے۔ علی متقی ایک خدا ترس بزرگ تھے۔ وہ درویش صفت، شکستہ دل، وسیع المشرب، متین اور پرہیزگار انسان تھے۔ ان کے اخلاق حمیدہ، اوصاف ستودہ، طبع مشکل پسند، جان درد مند، آنکھیں نم اور حال درہم تھا۔ انہوں نے ترکِ لباس کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ علمِ ظاہری شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے حاصل کیا تھا اور بہت ریاضت کر کے دولتِ باطنی بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ شب و روز ذکرِ خدا میں محو، ہر وقت شرابِ شوق سے سرشار، دن بھر عالمِ حیرت میں غرق اور راتوں کو جاگتے رہتے تھے۔ ان کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کو رونق بخشتا تھا۔ ان کی پہلی شادی خان آرزو کی بہن سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے حافظ محمد حسن یعنی میر کے بڑے سوتیلے بھائی پیدا ہوئے۔ ان کی دوسری شادی کس خاندان میں ہوئی محققین کو اس کا کچھ علم نہیں۔ ان سے دو بیٹے محمد تقی، محمد رضی اور غالبًا ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

3.3.2 میرؔ کی پیدائش، تعلیم اور ازدواجی زندگی

نام میر محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ محمود آباد ہاؤس لکھنؤ میں موجود میر کے چوتھے دیوان کے قلمی نسخے میں نوادر الکملا کے حوالے سے میر کا سنہ ولادت ۱۱۳۵ ہجری بہ مطابق ۱۷۲۳ء بتایا گیا ہے۔ اکثر مورخین و محققین نے میر کی پیدائش ۲۰ ستمبر، ۱۷۲۲ء لکھی ہے اور اکبر آباد کو میر کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ میر اپنے نسب کے سلسلے میں فاطمی سیادت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے بعض معاصرین نے اس پر اعتراض کر کے انہیں پیشے کے اعتبار سے نانبائی سمجھا ہے۔ خوشحال زیدی نے میر کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں پہلا دوران کے والد کی وفات تک

ہے اور دوسرا ان کی وفات کے بعد تک قرار دیا ہے۔

علی متقی نے ایک سید زادے میر امان اللہ (جسے وہ ''برادرِ عزیز'' کہتے تھے) کو راہِ راست پر لگا دیا اور معارفت کے درجے طے کرائے۔ یہ امان اللہ میر کو فرزند کی طرح رکھتے تھے، ان کی پرورش کرتے تھے اور ان ہی سے میر نے قرانِ شریف پڑھا۔ ان کے علاوہ میر نے کچھ تعلیم میر جعفر (عظیم آبادی) سے بھی لی۔ ریختہ موزوں کرنے کی مشق سید سعادت علی (امروہی) سے حاصل کی۔ نثار احمد فاروقی کا کہنا ہے کہ میر کی تعلیم زیادہ تر خان آرزو کی ہی مرہونِ منت ہے۔ (میر ابتدائیہ، ص: ۳۵) خواجہ احمد فاروقی کا بھی خیال ہے کہ انہوں نے غنچۂ استعداد کی شگفتگی، الفاظ و تراکیب اور زبان کے قواعد و ضوابط کی خوشہ چینی بھی آرزو سے ہی کی۔ لیکن وہ سید سعادت علی کو میر کا استاد نہیں مانتے البتہ ان کو میر کی شعر گوئی کا محرک کہتے ہیں۔ اُنیس برس کی عمر میں میر نے اچھی طرح شاعری شروع کی تھی۔ میر امان اللہ جب میر کو احسان اللہ درویش کے پاس لے گئے تو انہوں نے کہا کہ اگر اچھی طرح اس کے پر نکل آئے تو ایک ہی ٹری میں آسمان کے پار پہنچے گا۔ (ذکرِ میر، ص: ۷۷) میر جب دس سال کے ہوئے تو امان اللہ نے وفات پائی۔ ایک برس بعد والد نے بھی انتقال فرمایا۔ دلگیری، استغراق، کم آمیزی، اندروں بینی، درمندی، عشق، صوفیا و فقرا کی صحبت کی وجہ سے دنیا کی بے ثباتی ابتدا سے ہی میر کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ ان ہی صفات کی وجہ سے ان میں استغنا، خودداری اور صبر و استقلال جیسی صفات بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن ان سے میر نے آرام کوشی یا آلسی نہ سیکھی لہٰذا ان صفات کے باوجود تلاشِ معاش کے سلسلے میں انہوں نے بہت تگ و دو کی ہے، دہلی، لکھنو، راجپوتانہ، کھجات، برسانہ کے سفر اسی مقصد کے لیے کیے۔ کچھ ناقدین کا کہنا ہے کہ میر دنیا سے بے تعلق تھے، لیکن جمیل جالبی کے مطابق یہ صحیح نہیں ہے کہ میر دنیا سے بے تعلق تھے۔ اگر وہ دنیا سے بے تعلق ہوتے تو ایسی شاعری نہیں کر سکتے تھے جو آج بھی ہمارے لیے ایک زندہ تخلیقی عمل ہے۔

نثار احمد فاروقی کے مطابق میر نے ۱۷۴۱ء تا ۱۷۴۷ء کے دوران خان آرزو کے گھر میں رہ کر ان کے گھر یا خاندان کی کسی لڑکی سے عشق کیا اور بہت شدومد سے کیا۔ وہ اس درجہ عشق میں مبتلا ہوئے کہ انہیں چاند میں ایک صورت نظر آنے لگی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''چاندنی رات میں ایک پیکرِ خوش صورت، کمالِ خوبی کے ساتھ کرہ قمر سے میری طرف بڑھتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا، جدھر بھی میری آنکھ اٹھتی اسی رشکِ پری پر پڑتی، جس طرف بھی دیکھتا تھا، اسی غیرتِ حور کا تماشا کرتا تھا۔'' (ذکرِ میر، ص: ۱۱۵) نثار احمد فاروقی کے مطابق میر یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کی محبوبہ کا نام مہتاب یا قمر یا ماہ بیگم یا ماہ پارہ ہوگا، گویا اس کو انہوں نے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ احمد حسین سحر نے بھی لکھا ہے کہ میر اپنے شہر کی ایک پری تمثال سے در پردہ عشق کرتے تھے:

اس مہ کے جلوے سے کچھ تا میر یاد دیوے
اب کے گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

''ذکرِ میر'' کے مطالعے سے یقیناً اس طرح کا شبہ ہوجاتا ہے لیکن نثار احمد فاروقی کی مذکورہ باتیں بھی قیاسی ہیں لہٰذا ان کو حتمی ماننا صحیح نہیں ہے۔ بہر کیف انھی دنوں عشق میں ناکامی کے سبب یا دیگر وجوہات کی بنا پر میر کو جنوں کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ ان کے والد کی مرید فخر الدین کی بی بی نے ان کے علاج میں اچھی پہل کی اور بہت روپیا خرچ کیا۔ جھاڑ پھونک کرائی، طبیبوں کو بلایا، جس سے میر کو فائدہ ہوا اور کچھ مدت بعد صحت یاب ہوگئے۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ میر کی پہلی شادی غالباً دہلی اور دوسری شادی لکھنو میں ہوئی۔ ان کے دو بیٹے میر فیض علی فیض اور حسن عسکری عرف کلو عرش اور ایک بیٹی تھی جو بیگم تخلص کرتی تھی۔ ان دونوں نے میر کی زندگی ہی میں انتقال کیا، البتہ میر کلو عرش کئی سال تک زندہ رہے ان کا دیوان بھی مرتب ہوا ہے، بڑھاپے کی وجہ سے ان کی کمر خم ہوگئی تھی اور وہ افیون کھانے لگے تھے۔ ہر وقت ان کی آنکھیں بند رہتی تھیں۔

3.3.3 میرؔ کی ملازمت اور اسفار

عزیز طلبا! جیسا کہ کتابوں میں ذکر ملتا ہے کہ میر کی خان آرزو کے ساتھ نہیں نبھتی تھی۔ آپسی ناچاقی کی وجہ سے ان کے درمیان بدمزگی پیدا ہوگئی تھی۔ ایک دن کھانے کے وقت آرزو سے ان کی تلخ کلامی ہوئی تو میرؔ ان کا گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ یہاں سے نکل کر انھوں نے وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی حویلی کے پاس رک کر نہر میں پانی پیا۔ وہاں ایک علیم اللہ نامی شخص نے میر کو پہچان لیا اور ان کو رعایت خاں سے ملا دیا۔ رعایت خاں میر کے ساتھ خوبی سے پیش آئے اور انہیں اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ ایک دن رعایت خاں نے میر سے ڈوم کے ایک لڑکے کو ریختہ کے کچھ اشعار رٹانے کے لیے کہا، لیکن میر نے اس کی تعمیل میں کراہت کی اور یہ بات ان کی نازک طبیعت پر گراں گزری، دو تین دن بعد خانہ نشین ہوگئے اور اس طرح ان کی نوکری چھوٹ گئی۔ لیکن رعایت خان نے میر کی رعایت کے پیشِ نظر ان کے بھائی محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر نوکری دے دی۔ اس کے بعد میر نے نواب بہادر کے یہاں نوکری کی۔ وہ میر کا حد سے زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ صفدر جنگ کی موت کے بعد میر بے روزگار ہوئے تو مہانرائن نے انہیں داروغہ دیوان خانہ میر نجم الدین علی سلام کے ذریعے سے بلوایا اور اپنے دربار سے وابستہ کیا، اس طرح میر کے یہ دن فراغت سے گزر بسر ہوئے۔ انہیں دنوں کچھ نامساعد حالات سے تنگ آکر میر نے سراج الدین خان آرزو کی ہمسائیگی بھی ترک کر دی اور وہ محمد اسحاق عمدۃ الملک نواب امیر خان انجام کی حویلی میں آکر رہنے لگے۔ اس کے بعد راجا جگل کشور نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا اور اشعار کی اصلاح کرنے کے لیے کہا، لیکن ان کا کلام قابل تصحیح نہ تھا اس لیے میر نے ان پر خط کھینچا۔ اس کے بعد راجا ناگر مل نے اپنی تنگی کے باوجود کچھ وظیفہ میر کے لیے مقرر کیا جو وہ ایک سال تک جاری رہا، جس کی وجہ سے یہ سال انھوں نے سکھ چین سے گزارا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے میں سڑک کے کنارے میر کا جو تکیہ یعنی مکان تھا وہ ڈھہ گیا جس سے انھیں بہت کوفت ہوئی۔ اس پر انھوں نے راجہ سے گزارش کی کہ میں پریشانی کی وجہ سے شہر سے نکل جانا چاہتا ہوں انہوں نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یوں وہ بال بچوں کو لے کر پیادہ پا نکلے، دن بھر میں ۸، ۹ کوس

منزل طے کرکے رات ایک سرائے میں درخت کے نیچے گزاری۔ اگلی صبح راجا جگل کشور کا وہاں سے گذر ہوا تو انہوں نے وہاں پر بے سہارا لوگوں کی دادرسی کی اور انہیں ایک قصبہ میں لے کر گئے۔ ذی الحجہ کی آخری تاریخ تک میر وہیں برسانا میں مقیم رہے اور ۱۱ محرم مطابق ۱۱ اگست ۱۷۶۱ء کو وہاں سے نکل کر کمھیر پہنچے۔ یہاں صفدر جنگ کے خزانچی بہادر سنگھ ان دنوں راجا کے ساتھ ایک شام آئے اور میر کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا، جس سے میر کے یہ دن راحت سے گزرنے لگے۔ بیس یا بائیس سال بعد ۱۷۶۲ء میں میر اکبرآباد واپس آگئے۔ وہاں والد اور چچا کے مزاروں کی زیارت کی۔ وہ صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لیے جاتے تھے۔ ان دنوں شاعر کی حیثیت سے وہ بہت مشہور ہو چکے تھے لہٰذا وہاں کے شعرا بھی کثرت سے ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھومے، وہاں کے عالموں، فقیروں سے بھی ملے۔ لیکن ان کے بیتاب دل کو تسلی نہ ملی اور نہ ان کی ملاقات کسی صاحبِ دل شخص سے ہوئی، جس کے ساتھ بیٹھ کر وہ باتیں کرتے، یہاں تک کہ انہیں یہ شہر ایک وحشت ناک خرابہ لگنے لگا۔ یہاں وہ چار ماہ رہے اور واپس سورج مل کے قلعوں میں آگئے۔ جب راجا ناگرمل ڈیگ سے چل کر جواہر سنگھ سے ملنے گئے تو میر بھی ان کے ساتھ تھے اس طرح ایک بار پھر انہیں آگرہ جانے کا موقع ملا۔ آگرے کے دوسرے سفر میں وہ وہاں پندرہ دن رہے۔ راجا ناگرمل کے بیٹے کی رائے کے موافق جب انہوں نے بادشاہ کے بجائے مرہٹوں سے مدد لینی چاہی تو فرخ آباد کے اس سفر میں جب ان کا ورود دلی میں ہوا تو وہ رائے بہادر سنگھ سے ملے اور اپنے احوال سے انہیں مطلع کیا، انھوں نے مقدور بھر ان کے حالات سدھارنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد میر کو وجیہ الدولہ سے بھی وظیفہ ملنے لگا۔ ۱۷۷۲ء کے دوران انھوں نے پھر خانہ نشینی اختیار کی تھی۔ اس خانہ نشینی کے بعد وہ شہر سے کہیں دور نکل جانا چاہتے تھے، لیکن اسباب کے فقدان کے سبب وہ نہیں جاسکے۔ نواب سالارِ جنگ پسر اسحٰق خان مؤتمن الدولہ نے وزیر الممالک نواب آصف الدولہ سے کہا کہ ازراہِ عنایت میر کے لیے زادِ راہ بھیج دیا جائے تو وہ آئیں گے۔ نواب صاحب نے اس کی اجازت دی۔ مؤتمن الدولہ نے انہیں خط لکھا، خط لکھتے ہی ۱۷۸۲ء میں میر لکھنو کے لیے چل پڑے۔ چند روز میں فرخ آباد کی راہ سے گزر ہوا۔ فرخ آباد کے رئیس مظفر جنگ نے بہت چاہا کہ میر یہاں کچھ دن ان کے ساتھ ٹھہر جائیں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور وہاں سے روانہ ہوکر منزلِ مقصود تک پہنچے۔ پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گئے جنھوں نے میر کی بہت عزت افزائی کی۔ چار پانچ روز کے بعد نواب مرغ لڑانے کے لیے آئے تو میر بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں پہچان لیا اور محبت سے بغل گیر ہوئے اور اپنا کلام سنایا۔ سالار جنگ نے نواب آصف الدولہ سے میر کی حالت بیان کی تو دو تین دن بعد انھوں نے میؔر کو اپنے دربار میں بلایا۔ وہاں میر نے قصیدہ پیش کیا اور یوں نواب صاحب نے میر کو اپنی ملازمت میں شامل کرلیا۔ ۱۷۸۳ء میں نواب شکار کھیلنے کے لیے گئے تو میر بھی ہمراہ تھے، اسی دوران انھوں نے نظم ''شکارنامہ'' لکھی۔ اس کے بعد نواب سعادت علی خان نے بھی میر کی سرپرستی جاری رکھی، ان کے یہاں سے میر کو دوسو روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، بعد میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ رقم رک گئی تھی۔ دلی کے مقابلے میں لکھنو میر کو راس نہ آیا وہ بار بار دلی کو یاد کرتے تھے:

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

لکھنو دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میر کی سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

دراصل میر کے نزدیک دلی ایک پوری تہذیب تھی۔ جوان کی آنکھوں کے سامنے مٹتی جارہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے مٹتی ہوئی تہذیب کے المیے کو اپنی شاعری میں جذب کرلیا۔ ذات کے اندر سرایت اس المیہ نے انہیں بے قرار کر رکھا تھا۔ ویسے بھی حقیقت یہی ہے کہ دنیا جائے قرار نہیں اور بڑے انسان کے لیے اور بھی یہ بے قراری کا سبب بن جاتی ہے۔ آخری ایام میں ان کی ایک جوان بیٹی کا انتقال ہوا، اس کے دوسرے سال بعد بیٹا میر فیض علی بھی رحلت کر گئے، اس کے اگلے سال بعد بیوی چل بسی۔ ان مصائب سے میر کے دماغ میں خلل پڑ گیا۔ دانت پہلے ٹوٹ ہی گئے تھے۔ بینائی اور سماعت بھی کمزور ہوگئی تھی۔ قولج کے مرض نے زور پکڑا۔ جوڑوں میں درد رہنے لگا، اس درد کے ازالے کے لیے مسہل دیا گیا جس سے اور بھی زیادہ مشکلات پیدا ہوگئیں۔ دو تین دن اسی حالت میں گزرے، آخر بروز جمعہ ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ ہجری مطابق ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء کی شام لکھنو میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ دوسرے دن اکھاڑا بھیم کے قبرستان میں اپنے بیوی بچوں کے متصل دفن کیے گئے۔ ریلوے لائن بچھنے کی وجہ سے اب قبر کا نشان بھی مٹ گیا ہے۔ میر کی وفات پر ناسخؔ نے اس مصرع ''واویلا مردِ شہ شاعراں'' سے تاریخ نکالی۔ اس لحاظ سے ان کی تاریخ وفات ۱۲۲۵ ہجری مطابق ۱۸۱۰ء ہے۔

میر کے سرمایۂ سخن میں چھ دواوین پر مشتمل اردو کلیات، ایک فارسی دیوان، تذکرۂ نکات الشعرا، خود نوشت سوانح ذکرِ میر، رسالہ فیضِ میر، وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ میر نے تقریباً ۳۶ مثنویاں لکھی ہیں۔ قصۂ دریائے عشق کو انہوں نے فارسی نثر میں تحریر کیا ہے۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاعری میں میرؔ سے اصلاح لینے والوں کی تعداد کم وبیش پچاس شعرا تک پہنچتی ہے۔ جن میں غلام علی راسخ عظیم آبادی، مرزا علی لطف، میر عبدالرسول نثار جیسے لوگ بہت مشہور ہوئے۔

3.3.4 میرؔ کی شخصیت

میر تقی میرؔ کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے پہلے ان کے گھر کے ماحول اور بطورِ خاص ان کے والدِ گرامی کا بنیادی ہاتھ ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا کہ ان کے والد ایک درویش صفت انسان تھے۔ لہٰذا یہ درویشی میر کے مزاج کا بھی حصہ بن گئی۔ علی متقی نے ان کو عشق کرنے کی تلقین کی تھی۔ اس تلقین کو انہوں نے اپنی زندگی میں اتار لیا تھا:

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ

یہی عشق ان کی شاعری کا تخلیقی سرچشمہ اور روح ہے۔اسی عشق کی بدولت ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل ہوئی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''یہی وہ زاویہ ہے جس سے میر نے زندگی، انسان، معاشرے اور فرد کے رشتوں کا سراغ لگایا اور یہی وہ مرکزی نکتہ ہے جس سے ان کی شاعری کا دائرہ بنتا ہے۔(ص:۴۰۱) بچپن میں ہی ان کے والد نے ان کو نصیحت کی تھی ''بیٹا عشق کرو! عشق دنیا کا سب سے حسین جذبہ ہے۔'' اس لیے ابتدا سے ہی انہوں نے عشق کے جذبے کی پیروی کی۔انہوں نے کیفیاتِ عشق کو بہتر طور پر اپنے کلام میں بیان کیا ہے۔ بالخصوص ہجرت، فراق، جدائی کا بیان ان کے کلام کا بنیادی خاصہ ہے:

میں طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہوں لیکن
سینے میں کوئی دل کو جیسے ملا کرے ہے

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

میر کی پیدائش سے لے کر موت تک ہندوستان اور دلی کی بالعموم اور مسلمانوں کی بالخصوص صورت حال ابتر تھی۔ جس کے اثرات میر کی زندگی پر بھی خاصے مرتب ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد میر کے معاشی حالات بھی بگڑ گئے۔جس کی وجہ سے ان کو غربت، پریشانی، مصائب، محرومی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ان کا گھر مسمار ہو گیا جس کے نیچے ان کا بیٹا دب گیا۔دلی کو اجڑتے دیکھا، احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے چشم دید گواہ بنے۔ مالی مشکلات نے ان کے مزاج میں مزید کجی پیدا کر دی۔ان سب حالات کا اثر میر کی شاعری پر پڑا۔حال یہ ہوا کہ جو حالات باہر تھے وہی حالات میر کے اندر بھی پیدا ہو گئے تھے۔یعنی خارجی عوامل کو انہوں نے داخلی طور پر محسوس کیا گویا داخلی حالات خارجی حالات کے زائدہ تھے۔اس وجہ سے جب وہ بطور شاعر سامنے آتے ہیں تو وہ دکھ، درد، کرب کے ساتھ ساتھ ظاہری مسائل کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔دوسری طرف چھ سو سالہ تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ یہ اجتماعی غم بھی اس دور کے لوگوں کو کھائے جا رہا تھا۔ان دونوں غموں نے ان کو جہاں مغموم بنا دیا تھا وہیں حساس بھی کر دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت سوز وگداز سے بھر گئی تھی۔انہوں نے اپنی شاعری میں سوز وگداز کو اس طرح ضم کیا کہ میر اور جگ بیتی گویا ایک ہی سکے کے دو رخ بن گئے تھے۔یعنی اگر میر کو پڑھا تو گویا اس دور کو پڑھا اور اگر اس دور کو پڑھا تو گویا میر کا مطالعہ کیا۔یوں میر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔لہٰذا اس عہد میں میر کا کارنامہ سب سے بلند ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے کس طرح ایک پوری تہذیب کو اپنی ذات میں سمیٹ لیا اور اس کو نہ صرف یہ کہ خرد برد ہونے سے بچایا بلکہ خود اس کے لیے ایک قلعہ ثابت ہوئے۔شاہد پرویز کے مطابق ''میر اپنے عہد کی سب سے مکمل اور سب سے زیادہ تہذیب یافتہ شخصیت کا نام ہے۔''

عزیز طلبا! یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ میر قنوطی شاعر ہرگز نہیں تھے۔شمس الرحمن فاروقی کا کہنا درست ہے کہ میر کے ساتھ جہاں بہت سی ناانصافیاں ہوئی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری کے بارے میں ان کی زندگی سے اور

ان کی زندگی کے بارے میں ان کی شاعری سے دلیل لانے کی کوشش دیگر بڑے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ہوئی۔ مثلاً عندلیب شادانی نے امرد پرستی کے اشعار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ امرد پرست تھے۔ اسی طرح یاس و حرماں، غم و اندوہ کے اشعار سے یہ باور کرایا گیا کہ میر یاس پرست اور قنوطی ہیں اور ہر وقت روتے ہیں۔ لیکن یہ میر کے طبیعت کی افتاد ہے۔ مجنوں گورکھپوری کو بھی ہمیشہ اس سے اختلاف رہا۔ باقر مہدی کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لغو بحث آج تک جاری ہے کہ میر قنوطی تھے یا نہیں؟ وہ بے کسی اور بے بسی کا اتنا ماتم کیوں کرتے ہیں؟ ان سوالات کے جواب میں فاروقی لکھتے ہیں کہ یہ ''یاد رکھنا ضروری ہے کہ میر کی شخصیت ''صبر'' کے خمیر سے ابھری تھی اور اس کا پہلا امتحان کامیاب عشق کی ناکامیاں تھیں۔'' آلِ احمد سرور کہتے ہیں کہ میر کے متعلق بہت کچھ سوچے سمجھے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انہیں اس طرح میر کی شاعری کی ''خصوصیات کے تعین اور ان کے مدارج کے متعلق بے شمار جزوی اختلافات'' نظر آتے ہیں۔ آل احمد سرور کے بقول تذکروں کے تعارف، تحسین یا تنقیص کے ''غبار میں حقائق کی کرنیں ضرور ہیں مگر اس زمانے کے تہذیبی اور اخلاقی معیاروں نے تنقید کو تقریظ اور تجزیہ کو تاثرات کی ایک دلدل بنا دیا ہے۔'' وہ نشتریت، سادگی، قنوطیت، جیسے الفاظ کی نشاندہی کو میر کے رنگ کی ترجمانی نہیں مانتے۔ بلکہ وہ ان اصطلاحات کو گمراہ کن قرار دیتے ہیں۔ سرور کے نزدیک تو ''ان کی مایوسی اور ناکامی، یاس و حرماں اور رنج و غم بھی ان کو قنوطی نہیں بنا پاتے۔'' گوپی چند نارنگ ان کی شاعری کو ''دردمند انسانیت کی آواز'' قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی کو میر ''ایک مضطرب روح کے مالک اور منتشر زمانے کے نمائندہ فرد'' نظر آتے ہیں۔ حسن عسکری نے بھی اسی نظریے کو تسلیم کیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اپنا مقابلہ دوسرے انسانوں سے کرتے ہیں۔ وہ زندگی سے مایوس یا بیزار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تسلیم و رضا اور صبر و قرار کی تلقین کرتے ہیں۔ عسکری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''جب آدمی اپنی خودی کو کائنات، زندگی اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دے لیکن ساتھ ہی اپنی خودی سے مایوس اور بیزار بھی نہ ہو اور یہ رائے کوئی قنوطیت پسند اور یاس پرست آدمی نہیں دے سکتا۔'' فاروقی میر کو انسانی رشتوں کے تعلق سے سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں۔ میر بیتی کے ضمن میں میر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے جمیل جالبی نے دو بنیادی علامتوں ''دل اور دلی'' کا ذکر کرتے ہوئے ان کے تخلص کو ''زندگی کا استعارہ'' کہا ہے۔

میر کی شخصیت میں انانیت تھی۔ یہ انانیت انہوں نے نہ صرف اپنے سے کم ہنر یا کم حیثیت لوگوں کے ساتھ برتی ہے بلکہ جو ان کے حاکم و خیر خواہ تھے، ان کے ساتھ بھی میر نے ایسا ہی معاملہ کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر، خان آرزو، رعایت خان وغیرہ کے واقعات میں جس کا ذکر ملتا ہے۔ شخصیت میں ایک ٹھہراؤ، ہم آہنگی و توازن تو بہر حال مبالغہ ہے لیکن مصلحت کوشی میں کوئی شک نہیں ہے کہ شاعری کے معاملے میں انہوں نے بہت حد تک اس سے پرہیز کیا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو خاطر میں نہیں لائے۔ لیکن اس آڑ میں انہوں نے بہت سے لوگوں کے ساتھ زیادتی بھی کی ہے۔ مظہر جانِ جاناں کے شاگرد انعام اللہ خاں یقین مصحفی کے بقول وہ شاعر ہیں جنہوں نے

ایہام گوئیوں کے دور میں صاف و پاکیزہ ریختہ لکھا۔ ابتذال، رکاکت اور ایہام کے تضاد کے دور میں یقین کی مقبولیت کئی لوگوں کو راس نہ آئی۔ حتیٰ کہ اس رقابت میں میر شامل ہی نہیں بلکہ پیش پیش ہیں۔ جمیل جالبی کا ماننا ہے کہ ''میر جیسے خود پرست کے لیے یقین کی مقبولیت اور احساس افتخار سوہانِ روح بن گیا۔ محمد حسین آزاد میر کا حد درجہ دفاع کرنے کے باوجود بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ''میر کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انہیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت سے اور فارغ البالی سے محروم رکھا اور وہ وضع داری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔'' میر 'نکات الشعرا' کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، ان ہزار میں ایک بھی ان کے طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ سودا کو جاہل کہا ہے اور اکثر شعرا کے بارے میں میر کا رویہ یہی رہا ہے۔ اس زمانے کے مسلم الثبوت استاد، اعلیٰ ذہانتوں کے مالک اور جدتوں کے تراش ظہورالدین شاہ حاتم کے بارے میں بھی میر ذاتی کد سے کام لیتے ہیں۔ جنہیں لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرہ ''چمنستانِ شعرا'' میں ''علامہ سخن طرازاں'' کہا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''ان کے دلنشین خیالات معنی کی نزاکت سے مملو ہوتے ہیں۔'' بہر کیف اس دور میں میر گروہ بندی میں لگے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ سب استادوں کو راستے سے ہٹا کر خود صدرِ مجلس بن جائیں، جو کہ وہ بعد میں بن گئے۔ ناقدین و محققین کی آرا کے ذریعے معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے معاصرین کے ساتھ زیادتی کی۔ لیکن ان کی شاعرانہ عظمت نے ان کے عیب چھپا لیے یہی میر کی ساحرانہ شخصیت کا راز ہے کہ ہم ان کی ذات کو چھوڑ کر ان کے کلام پر فریفتہ ہیں۔

3.3.5 ماحصل

میر کے بزرگ حجاز سے احمد آباد گجرات آئے۔ علی متقی میر کے والدِ ماجد تھے۔ میر کی کم عمری میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ میر کو ان کے والد کے ایک مرید میر امان اللہ نے فرزند کی طرح پالا، ان کی پرورش کی اور ان کو قرانِ شریف پڑھایا۔ میر جب دس سال کے ہوئے تو امان اللہ نے وفات پائی۔ میر کی پہلی شادی دہلی اور دوسری شادی لکھنو میں ہوئی۔ ان کے دو بیٹے میر فیض علی فیض اور حسن عسکری عرف کلو عرش اور ایک بیٹی تھی۔ چھ دواوین پر مشتمل اردو کلیات، ایک فارسی دیوان، تذکرہ نکات الشعرا، خودنوشت سوانح ذکرِ میر، رسالہ فیضِ میر ان کی ادبی یادگار ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف کو موضوعِ سخن کیا ہے۔ سیاسی اور سماجی بدحالی کے سبب میر نے دربدری کی زندگی گزاری۔ بکھرتی ہوئی تہذیب کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس لیے انہوں نے تہذیب کے مٹتے المیے کو اپنی شاعری میں جذب کیا۔ لہٰذا ان کی شاعری دکھ، درد، کرب اور ظاہری مسائل کا آئینہ بن گئی۔ دل کے مرثیے لکھے ہیں۔ جہاں تک رہا مسئلہ ان کی انانیت کا، تو وہ ان کی معاشرے اور مسائل کی دین ہے۔ ان کی شخصیت پر عشق غالب تھا۔ عشق ہی ان کی شاعری کا تخلیقی سرچشمہ اور روح ہے۔ اسی عشق کی بدولت ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے۔

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کے آبا و اجداد اور خاندان کے متعلق واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کی طرز معاشرت اور ان کی ذاتی زندگی کے اہم پہلوؤں کی جانکاری حاصل کی۔
- میرؔ نے تہذیبی شکست وریخت کو اپنی شاعری میں کس طرح سمویا، اس سے آگہی حاصل کی۔
- میرؔ کی شخصیت کے ٹیڑھے اور روکھے پن کی وجوہات کو سمجھ لیا۔
- ناقدین کی آرا سے ان کی شخصیت کے نمایاں امتیازات کا علم حاصل کیا۔

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میرؔ کے بزرگ کہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

۲۔ میرؔ کے والد ماجد علی متقی کی زندگی کے کچھ اوصاف بیان کیجیے۔

۳۔ میرؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کس نے کی؟

۴۔ میرؔ کے سفر آگرہ کی روداد سپرد قلم کیجیے۔

۵۔ میرؔ کے سرمایۂ سخن کو تحریر کیجیے۔

3.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ ''ذکر میر'' کے مطابق میرؔ کے بزرگ حجاز سے رختِ سفر باندھ کے دکن کی سرحد پر پہنچ کر احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی۔

۲۔ میر کے والد محترم علی متقی ایک خداترس بزرگ تھے۔ وہ درویش صفت، شکستہ دل، وسیع المشرب، متین اور پرہیزگار انسان تھے۔ ان کے اخلاق حمیدہ، اوصاف ستودہ، طبع مشکل پسند، جان دردمند، آنکھیں نم اور حال درہم تھا۔ انہوں نے ترکِ لباس کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ علمِ ظاہری اور دولت روحانی شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے حاصل کیا تھا۔ وہ شب و روز ذکرِ خدا میں محو، ہر وقت شرابِ شوق سے سرشار، دن بھر عالمِ حیرت میں غرق اور راتوں کو جاگتے رہتے تھے۔ ان کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کو رونق بخشتا تھا۔

۳۔ میر امان اللہ نے میر کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ یہ میر کو فرزند کی طرح رکھتے تھے، ان کی پرورش کرتے تھے اور انھوں نے ہی میر کو قران شریف پڑھایا۔

۴۔ میرؔ بیس یا بائیس سال بعد ۱۷۶۲ء میں اکبرآباد واپس لئے، وہاں والد اور چچا کے مزاروں کی زیارت کی۔ وہ صبح وشام دریا کے کنارے سیر وتفریح کے لیے جاتے تھے۔ ان دنوں شاعر کی حیثیت سے میر بہت مشہور ہو چکے تھے، لہٰذا وہاں کے شعرا بھی ان سے کثرت سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھومے، وہاں کے عالموں، فقیروں سے بھی ملے۔ لیکن ان کے بیتاب دل کو تسلی نہ ملی اور نہ ہی ان کی ملاقات کسی صاحبِ دل شخص سے ہوئی، جس کے ساتھ بیٹھ کر وہ باتیں کرتے، یہاں تک کہ انہیں یہ شہر ایک وحشت ناک خرابہ لگنے لگا۔ وہاں وہ چار ماہ رہے اور واپس سورج مل کے قلعوں میں آ گئے۔ دوسری مرتبہ جب راجا ناگرمل ڈیگ سے چل کر جواہر سنگھ سے ملنے گئے تو میر بھی ان کے ساتھ تھے اس طرح ایک بار پھر انہیں آگرہ جانے کا موقع ملا۔ آگرے کے دوسرے سفر میں وہ وہاں پندرہ دن رہے۔

۵۔ میرؔ کے سرمایۂ سخن میں چھ دواوین پر مشتمل اردو کلیات، ایک فارسی دیوان، تذکرۂ نکات الشعرا، خودنوشت سوانح ذکرِ میر، رسالہ فیضِ میر، وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ میر نے تقریباً ۳۶ مثنویاں لکھی ہیں۔ قصۂ دریائے عشق کو انہوں نے فارسی نثر میں تحریر کیا ہے۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

3.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
آفرینش	:	پیدائش، عدم سے وجود میں آنا
استغراق	:	کسی فکر، خیال یا کام میں غرق ہو کر سب کچھ بھول جانے کی کیفیت، گہری دلچسپی
استغنا	:	بے نیازی، بے پرواہی، دولت مندی، غنی ہونا
استقلال	:	ثابت قدمی، ضبط وتحمل سے اپنے مسلک پر جمے رہنا، قائم رہنا، ڈٹے رہنا
پری تمثال	:	پری پیکر، پریوں جیسی صورت والا، نہایت خوبصورت، مجازاً معشوق
دادرسی	:	انصاف، چارہ سازی، دادخواہی، فریادرسی، حق رسی
دستاویزی	:	دستاویز سے منسوب، تحریری، مستند
دلگیری	:	غمگینی، افسردگی، اداسی
ناچاقی	:	اَن بن، بگاڑ، رنجش، علالت، بدمزگی

نقاہت : وہ کمزوری جو بیماری سے اٹھنے کے بعد ہوتی ہے

3.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔	مجموعۂ نغز (تذکرۂ شعرائے اردو: قدرت اللہ قاسم)	:	مرتب محمود شیرانی
۲۔	آبِ حیات	:	محمد حسین آزاد
۳۔	میر تقی میرؔ حیات اور شاعری	:	نثار احمد فاروقی
۴۔	ذکرِ میر	:	میر تقی میرؔ
۵۔	میر کی شخصیت ان کے کلام میں (غالب نامہ) (جولائی ۲۰۰۰ء)	:	شمس الرحمٰن فاروقی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 4 ''ذکرِ میرؔ'' کا تنقیدی جائزہ

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 ''ذکرمیرؔ'' کا تنقیدی جائزہ

4.3.1 ''ذکرمیرؔ'' کا تعارف

4.3.2 ''ذکرمیرؔ'' کا جائزہ

4.3.3 ماحصل

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

4.6 سوالوں کے جوابات

4.7 فرہنگ

4.8 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کی شخصیت کے امتیازی پہلوؤں سے متعارف ہوں گے۔
- میرؔ کے عہد کے معاشرتی وسیاسی حالات سے روشناس ہوں گے۔
- میرؔ کے خیالات ونظریات کو جانیں گے۔
- میرؔ کے شعروسخن کی ترجیحات کو سمجھیں گے۔
- میرؔ کی خودنوست ''ذکرمیرؔ'' کی اہمیت وافادیت سے واقف ہوں گے۔

4.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میرؔ کے سوانحی حالات وکوائف کا تفصیلی مطالعہ کر کے ان کی حیات وشخصیت کے اہم گوشوں کو جاننے کی کوشش کی۔ اب آپ اس اکائی میں باضابطہ طور پر میر کی خودنوشت ''ذکر میر'' کا مطالعہ کریں گے، تاکہ آپ ان پہلوؤں پر از خود تنقیدی نظر ڈال سکیں جو میر نے ذاتی طور پر اپنے متعلق لکھا ہے۔ دراصل اس کتاب کو میر نے فارسی میں تحریر کیا ہے (جس کے متعدد ترجمہ ہو چکے ہیں ان میں نثار احمد فاروقی کا ترجمہ ''میر کی آپ بیتی'' قابل ذکر ہے۔) اس کتاب میں میر نے اپنے ذاتی حالات وکوائف، عصری مسائل، سیاسی صورت حال، سماجی اتھل پتھل اور تعلقاتی حال وکیف کو بڑے شدومد سے نقل کیا ہے۔ اب آپ کو دیکھنا یہ ہے کہ آیا میرؔ کے بیانات تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے کس حد تک قابل قبول ہیں۔ اسی مقصد کے تحت ''ذکر میر'' کو آپ کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ویسے تو میر کی زندگی پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس کتاب کی اہمیت یوں زیادہ ہے کہ اسے خود میر نے لکھی ہے اور اپنی زندگی کے شب وروز اور اپنے فنی کمالات کا ذکر کیا ہے۔ جس کا مفصل مطالعہ آپ مندرج ذیل سطور میں کریں گے۔

4.3 ''ذکرِ میرؔ'' کا تنقیدی جائزہ

4.3.1 ''ذکر میرؔ'' کا تعارف

''ذکر میرؔ'' میر تقی میر کی خودنوشت ہے۔ خودنوشت جسے آپ بیتی بھی کہا جاتا ہے، وہ صنف ہے جس میں کوئی ادیب یا کوئی اہم انسان جو کسی نہ کسی میدان میں مشہور ومعروف ہو، اپنی زندگی کے مکمل حالات خود قلم بند کرتا ہے۔ چوں کہ اس صنف ادب میں آنکھوں دیکھی اور خود کی بھوگی ہوئی زندگی بیان ہوتی ہے، اس لیے اسے خالص اور زیادہ مستند دستاویز سمجھا جاتا ہے اور اس میں بیان کیے گئے حقائق پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کیا جاتا ہے۔ خودنوشت سوانح عمری یا سوانح حیات سے اسی لیے مختلف ہوتی ہے کہ اس میں قلم کار اپنا حال خود بیان کرتا ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی بہت ساری خودنوشتیں (آپ بیتیاں) لکھی گئی ہیں جن کے لکھنے والے اردو کے شاعر وادیب اور دانشور ہیں مگر جس اردو شاعر نے سب سے پہلے اپنی خودنوشت لکھی اور جو وقت کی گرد سے محفوظ رہ گئی وہ میر تقی میر کی خودنوشت ''ذکر میر'' ہے۔ کچھ دوسری خودنوشتوں کے ساتھ ساتھ ذکر میر کو بھی اردو ادب کے نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے تاکہ اردو کے طالب علم خدائے سخن میر تقی میرؔ کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی سے بھی اچھی طرح متعارف ہو جائیں اور میر کی شاعری کی سادگی، دردمندی، جاں سوزی اور اثر انگیزی کے اسباب جان سکیں۔

''ذکر میر'' فارسی میں لکھی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں مولوی عبدالحق نے اسے مرتب کر کے اورنگ آباد سے شائع کیا۔ اردو

والوں کے لیے اس کتاب کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے نثار احمد فاروقی نے ''میر کی آپ بیتی'' کے عنوان سے اس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا جس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۷ء میں مکتبہ برہان، دہلی سے شائع ہوا اور دوسرا چالیس سال بعد ۱۹۹۶ء میں انجمن ترقی اردو، نئی دہلی سے چھپا۔ اس کتاب کے ترجمے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اردو والے بھی جانیں کہ جس شاعر کو خدائے سخن کہا گیا اور جس کی عظمت کا اعتراف غالب، ذوق اور ناسخ جیسے بڑے شعرا نے کیا اور جسے خود بھی اپنی عظمت کا اس درجہ اعتراف تھا کہ انھوں نے یہ شعر تک لکھ دیا:

تم کبھی میرؔ کو چاہو کہ وہ چاہیں ہیں تمھیں
اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

یہ ایک تفصیلی خودنوشت ہے جو ''ذکر میر'' کا ہو بہو اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے بڑی محنت، لگن اور چاو سے کیا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ اس کتاب کی اپنے زمانے میں بڑی پذیرائی ہوئی اور آج بھی یہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ خلیق انجم کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جسے انھوں نے اس کتاب کے ''حرفِ آغاز'' میں لکھا ہے:

> ''یہ کام نثار احمد صاحب نے اتنی دقیقہ رسی اور ایسی محنت سے کیا کہ اب اسے ترجمے کی پہلی اشاعت سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ اسے بالکل نیا ترجمہ ہی سمجھنا چاہیے۔ سلیس، با محاورہ اور شگفتہ بھی، وفادار بھی، کہیں کہیں تو فارسی اور اردو کی عبارتیں، لفظ و معنی اور اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے بالکل ایک جان دو قالب نظر آتی ہیں۔''

(میر کی آپ بیتی، نثار احمد فاروقی، ۱۹۹۶ء، ص:۱۵)

اس کتاب کی افادیت کا پتا مالک رام کے ان جملوں سے بھی چلتا ہے جو اس کتاب کے مقدمے میں درج ہیں:

> ''اس کتاب کی اہمیت دوگونہ ہے۔ ایک انفسی دوسری آفاقی، انفسی یہ کہ اس سے میرؔ کے اپنے حالات جن سے متعلق کسی شبہے کا امکان نہیں، کم و بیش تفصیل سے معلوم ہو جاتے ہیں...... میر کے ذاتی حالات کے علاوہ یہ کتاب ہندوستان کی اس دور کی تاریخ کا بھی بہت اچھا ماخذ ہے...... نثار احمد فاروقی نے اپنا فرض بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ انھوں نے اصل مطالب سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے۔ ترجمہ کی زبان بھی شگفتہ اور سلیس اور با محاورہ ہے۔''

(میر کی آپ بیتی، نثار احمد فاروقی، ۱۹۹۶ء، ص:۲۰ تا ۲۲)

مالک رام کے اس بیان سے میر اور نثار احمد فاروقی دونوں کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ میر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے حالات خود قلم بند کیے ہیں جو ان کو اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں اور ان تمام تر غلط فہمیوں کو دور کرتے ہیں جو میر کے متعلق بے بنیاد حوالوں سے راہ پا گئی تھیں اور نثار احمد کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس اہم کتاب کو ایک مانوس زبان سے روشناس کرا دیا اور میر پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ فراہم کر دیے۔ خلیق انجم کے حرف آغاز اور مالک رام کے مقدمے کے علاوہ مترجم کی دو اور تحریریں بھی ہیں۔ ابتدائیہ کے عنوان سے ایک ابتدائیہ (طبع اوّل) اور دوسری ابتدائیہ (طبع ثانی)

ابتدائیہ (طبع اوّل) میں مصنف نے بتایا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں ان قلمی نسخوں کو سامنے رکھا گیا ہے جو اب تک دریافت ہوئے ہیں۔ ایک نسخہ اٹاوہ کا ہے، دوسرا نسخہ لاہور اور تیسرا نسخۂ رامپور۔ تینوں نسخوں کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے حقائق کی تفتیش و تلاش میں کافی محنت اور جد و جہد کی ہے تاکہ صحیح حقیقتیں سامنے آسکیں اور ہر ایک بات کی شہادت بھی سامنے آسکے۔ ان ابتدائیوں سے یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ میر اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی اور وہ محفوظ رہ گئی۔ ابتدائیہ میں نثار احمد فاروقی نے بتایا ہے کہ ذکر میر کا ابتدائی حصہ میر کے والد اور ان کے منہ بولے چچا ''امان اللہ'' کی تعریفوں اور تصوف کے نکات سے بھرا پڑا ہے جن میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ میر کی بیان کردہ بعض باتوں کے شواہد نہیں ملتے۔

ابتدائیہ طبع ثانی میں فاروقی نے یہ بتایا ہے کہ ایک طویل مدت تک میر کی سوانح حیات کے جو قلمی نسخے تیار کیے گئے، منظر عام پر نہ آسکے۔ میر کی وفات کے ۱۱۸ برسوں بعد یہ نسخے مولوی عبدالحق کے ہاتھ لگے اور انھوں نے اس کتاب کا متن مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا اور اسے ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا اور اس متن کی اشاعت کے بعد نثار احمد فاروقی نے اسے اردو میں منتقل کیا۔

''ذکر میرؔ'' کا آغاز ''دیباچہ'' کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس دیباچے میں خدائے بزرگ و برتر کی ثنا خوانی کی گئی ہے جو ہر انسان کو زبان دیتا ہے اور گویائی کی قوت عطا کرتا ہے۔ خدا کی حمد و ثنا میرؔ نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اسی دیباچے میں حمد کے بعد نعت کے عنوان سے سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ کی بڑائی بیان کی گئی ہے۔ اس نعت پاک کی خاص بات یہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی ذات پاک ایک ایسے پیشوا کی ہے جس کی قیادت کے بغیر کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسے رہبر کی ہے جس کی رہبری نہ ہو تو کوئی راستہ نہیں سوجھ سکتا۔

تیسری عبارت عرض مصنف کے عنوان سے ہے جس میں میرؔ نے اس کتاب کے محرکات واسباب بیان کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ بیکاری کے دنوں میں وہ جب گوشۂ تنہائی میں پڑے ہوئے تھے اور طرح طرح کے حوادث کا شکار تھے، اسی وقت گوشۂ تنہائی میں پڑے پڑے انھوں نے اپنی سوانح لکھ ڈالی اور یہ کتاب جس کا نام ذکر میر ہے کچھ لطیفوں پر ختم کی۔

ان تینوں عنوانات کی تفصیلات کے بعد میرؔ نے اپنی زندگی کے احوال لکھنا شروع کیے ہیں۔ پہلے اپنے بزرگوں کا حال بیان کیا ہے پھر ایک ایک کر کے مختلف عنوانات کے تحت اپنی زندگی کی روداد تحریر کی ہے۔ عرض مصنف سے لے کر عبرت و خاتمہ تک تقریباً سوا سو ذیلی عنوانات کے تحت میرؔ نے اپنی سرگذشت بیان کی ہے جس کا خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں:

میرؔ نے میر جعفر سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے، اپنے والد بزرگ وار جو کہ ایک بڑے روشن صفت صوفی منش اور درویش تھے کی درویشانہ صفات، اپنے منہ بولے اور بہت ہی عزیز چچا میر امان کا تذکرہ، والد کی رحلت کے بعد اپنے سوتیلے بھائی خان آرزو جو اس زمانے کے غالباً سب سے اہم اور مشہور شاعر تھے سے وابستگی اور پھر خاں آرزو کی ناراضگی اور ان کے رویے سے ملی مایوسی کا احوال، زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے مختلف نوابوں اور رئیسوں کے یہاں ملازمت کرنے، ایک شہر سے دوسرے شہر میں حصول معاش کے لیے بھٹکنے اور دشوار کن راستوں سے گذرنے، مختلف اسفار کی صعوبتیں اٹھانے اور اپنی حالتِ جنون کے درد و کرب برداشت کرنے جیسے حالات و واقعات اور طرح طرح کے حادثات و سانحات کو بڑے ہی پر اثر اور پر سوز انداز میں قلم بند کیا ہے۔

4.3.2 ''ذکرِ میرؔ'' کا جائزہ

''ذکرِ میرؔ'' کا خلاصہ یہ ہے کہ میر کا پورا نام میر تقی تھا۔ نام کے آخر میں انھوں نے ایک اور میرؔ کا اضافہ کر لیا جو ان کا تخلص بنا۔ ان کے بزرگ ملک حجاز سے دکن ہوتے ہوئے آگرہ پہنچے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ وہیں یعنی آگرے میں میرؔ کے دادا پیدا ہوئے۔ پلے بڑھے اور بڑے ہوئے۔ بڑی تگ و دو کے بعد فوج میں ملازمت حاصل کی۔ پچاس سال کی عمر میں دماغی بیماری کے شکار ہوئے، اسی حالت میں انھیں آگرے سے گوالیار جانا پڑا، راستے کے جھٹکوں نے انھیں جسمانی طور پر بھی بیمار کر دیا اور ایسے بیمار ہوئے کہ موت کے شکنجے میں جا کسے۔

ان کے دادا کے دو لڑکے ہوئے، ایک تو خلل دماغ کے سبب جوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے، ان سے چھوٹے میر کے والد تھے، والد کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا، چنانچہ دنیا کو ترک کر کے انھوں نے دین کا راستہ اختیار کیا اور اس میدان میں ایسی ریاضت کی، ایسے بڑے بڑے مجاہدے کیے کہ درویشی کی منزل تک پہنچ گئے۔ اسی باعث وہ علی متقی کے خطاب سے ممتاز ہوئے۔ میرؔ کے والد روز و شب خدا کی یاد میں رہتے تھے۔ انھوں نے خود تو خدا سے عشق کیا ہی دوسروں کو بھی خدا سے عشق کرنے کی تعلیم دی اور زور دے کر کہا کہ عشق کرو۔ اس لیے کہ انسان کو انسان بناتا عشق ہے۔ عشق ہی کندن کرتا ہے۔ میرؔ نے اپنے والد کے اس مسلک کی جی کھول کر تعریف کی ہے اور عشق کے فلسفے پر کافی خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ انھوں نے اپنے دادا کی بزرگی کے متعلق کئی قصے بھی درج کیے ہیں مثلاً:

دادا نے لاہور کا سفر کیا۔ ایک فقیر کے تکیے میں رات بسر کی۔ وہاں ایک ریاکار فقیر سے ان کی بحث بھی ہوئی۔

اسے ان کے والد نے صحیح راستہ دکھایا اور اپنا راستہ لاہور سے شاہ جہاں کی جانب موڑ لیا۔ دہلی پہنچ کر شیخ عبدالعزیز کے بیٹے قمرالدین خاں کے مکان میں قیام فرمایا۔

میرؔ نے اپنے والد کی بزرگی کے قصے تو بیان کیے ہی ہیں، ساتھ ہی اپنے چچا احسان اللہ کی درویشی کے واقعات پر بھی کافی توجہ صرف کی ہے۔ اپنے چچا کے متعلق لکھا ہے کہ انھیں درویشوں کی صحبت میں جانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن جب چچا نے سنا کہ بابا یزید نام کا کوئی فقیر پاس ہی کے کسی حجرے میں رہتا تو اس سے ملنے وہ وہاں بھی پہنچ گئے اور ان سے کسب فیض کیا۔

میر نے اپنے والد کے کلمات معرفت کا بھی بیان بڑے شد و مد کے ساتھ کیا ہے اور اس نکتے پر زور دیا ہے کہ ان کے والد صاحب فرماتے تھے کہ کائنات کے تمام ذروں میں اسی آفتاب (خدا) کا عکس ہے۔ اگر تم اس کی ادا پہچان گئے تو تمہارا دل کامیاب ہے۔

''ذکر میرؔ'' کے ابتدائی حصّے کی خاص بات یہی ہے کہ انھوں نے اپنے خاندان کے بزرگوں خصوصاً اپنے دادا، اپنے والد اور اپنے چچا کا خاص طور سے بیان کیا اور تینوں کے تقوے اور بزرگی کے قصے بھی تفصیل سے بیان کیے۔ بزرگ کے قصوں کے بیان کے دوران میر نے جگہ جگہ مختلف عناوین کے تحت تصوف کے نکات اور ان قصوں کے نچوڑ اور زندگی سے کشید کیے گئے اخلاقی عطر کو بھی پیش کیا۔ یہ بات اس کتاب کی چند باتوں میں سے ایک ہے اور یہ اس لیے اہم ہے کہ میر نے اپنے خاندان کے حوالے سے تصوف کی بہت ساری باریکیاں بیان کردی ہیں، اگر کوئی ان نکات پر عمل کرے تو دنیا اور دین دونوں میں کامیابیاں حاصل کرسکتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا اہم اور بنیادی حصہ وہ ہے جو ''میری سرگذشت'' کے عنوان سے میر نے بیان کیا ہے۔ اس حصے میں میر نے اپنی یتیمی سے لے کر دورِ جد و جہد تک کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ اس حصے میں میر نے باپ کے سائے سے محروم ضرور ہو گئے مگر چھاؤں کے لیے انھوں نے کسی کی مدد نہیں لی۔ خود دھوپ میں تپتے رہے، حالات کے تھپیڑے کھاتے رہے مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے، اس حصے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میر نے اس میں اپنی خودداری اور غیرت مندی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کا اظہار ان کے اس شعر سے بھی عیاں ہے:

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

اپنے وطن میں جب میر کو ٹھکانہ نہ مل سکا تو انھوں نے دہلی کا سفر کیا۔ دلی میں ایک نواب صاحب نے ایک روپیہ روزینہ وظیفہ طے کردیا۔ اسی سے میر کا گزارا چلتا رہا۔ اسکے بعد اپنے سوتیلے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین

علی خاں آرزو کے احسانات کا بھاری بوجھ اٹھایا۔ آرزو کے پاس کچھ دنوں تک رہے مگر بھائی نے اپنے ماموں خاں آرزو کو خط لکھ کر شکایت کی کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے، اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیے بلکہ دوستی کے پردے میں اس کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ خان آرزو نے اپنے بھانجے کے کہنے پر میرؔ کے ساتھ ایسا برا سلوک کیا کہ جس سے بد دل ہو کر میرؔ وہاں سے نکل آئے۔

''ذکر میر'' کا بڑا حصہ میر کے سفر اور اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات کے بیان پر مشتمل ہے۔ میر آگرے سے دلّی اور دلّی سے آگرہ تو بار بار گئے ہی، دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا۔ یہ تمام سفر تلاش معاش کے لیے کرنا پڑے۔ یہ سچ ہے کہ میر کا یہ سفر ان کا نجی سفر ہے اور تلاشِ معاش کے لیے کیا گیا مگر ان کا یہ سفر اپنے زمانے کا تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی مورخ اس کام پر مامور کر دیا گیا ہے کہ وہ یہ لکھے کہ کس شہر میں کس بادشاہ، نواب یا راجہ مہاراجہ کا راج تھا، کون سا حکمراں کیسا تھا؟ کس نے کس کس سے جنگ کی؟ کون فتح یاب ہوا؟ کس کی شکست ہوئی؟ اس جنگ میں کیسی تباہیاں ہوئیں؟ کس کس طرح واقعات و سانحات رونما ہوئے؟ کیسے کیسے حادثات درپیش ہوئے؟ کون سا حکمراں ظالم تھا اور کون سا نرم مزاج، کس کو رعایا کی فکر تھی اور کون صرف اپنی ذات تک محدود تھا؟ یعنی میر نے اپنے عہد کے تاریخی و سیاسی حالات، معاشرتی معاملات اور ملک کے اندرونی و بیرونی خانہ جنگیوں کی تفصیلات کا ذکر تمام تر جزئیات کے ساتھ کیا ہے۔ اس حصے میں میر نے بڑے ہی پر اثر انداز میں یہ دکھایا ہے کہ عہد مغلیہ کس طرح زوال پذیر ہوا۔ اس کی سلطنت کی ڈور کیسے ڈھیلی پڑتی گئی۔ کیسے بادشاہ وقت کمزور اور بے وقعت ہوتے گئے اور اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد بہت سے مغل بادشاہ ایسے کمزور اور بے اثر ہوئے کہ ملک میں چاروں طرف بدامنی اور افراتفری پھیل گئی۔ آپسی رنجشیں اتنی بڑھیں اور خود مختاری کا ایسا نشہ طاری ہوا کہ مغل فرماں روا تخت نشینی اور اقتدار کے ہوس کے نشے میں اندھے ہو کر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے۔ میر نے ایک طرف تو مغلوں کی آپسی عداوتوں اور سازشوں کا بیان کیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی دکھایا ہے کہ کس طرح مرہٹے اور روہیلے اپنے حملوں اور ہتھکنڈوں سے شہر دلی کو اجاڑنے پر تلے ہوئے تھے اور یہاں کے امن و سکون کے ماحول کو غارت کر رہے تھے۔ میرؔ کے اس دعوے کے ثبوت میں درج ذیل عنوانات کافی ہوں گے یہ ثابت کرنے کے لیے ذکر میر ایک طرح کی تاریخی دستاویز ہے جس میں میر کا زمانہ سانس لے رہا ہے۔

درانی کا حملہ، محمد شاہ کا انتقال، صفدر جنگ کی وزارت، غازی الدین خاں فیروز جنگ عالمگیر ثانی، راجا جگل کشور، راجا ناگرمل، ابدالی کے حملے، نجیب الدولہ سے جھڑپ، مرہٹوں کا فتنہ، دلّی میں لوٹ، جنگ پانی پت، ناگرمل کی نیابت، وزارت دلّی پھر لٹی، سورج مل کی بغاوت، میر قاسم کی معزولی، جواہر سنگھ اور مرہٹوں کی جنگ، سکھ فوج کی بدعہدی، جواہر سنگھ کا قتل، ضابطہ خاں پر چڑھائی، شاہ عالم اور مرہٹوں کی جنگ، نجف خاں کا اخراج، حسام الدین خاں کا حشر، جاٹوں سے جنگ، حافظ رحمت خاں کی شہادت، شجاع الدولہ کی وفات، نجف خاں کی وفات، نجف

خاں کے جانشینوں میں رسا کشی، فرنگی سے گٹھ جوڑ، شہزادہ جواں بخت، افراسیاب خاں کا قتل، مرہٹوں کا تسلط، راجپوتوں پر چڑھائی، غلام قادر خاں روہیلہ کے مظالم وغیرہ۔

ان عنوانات سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ''ذکر میر'' میں میرؔ نے اپنی آپ بیتی پر کم اور اپنے عہد کی جگ بیتی پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اس اعتبار سے ذکر میر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ یہ کتاب اپنے زمانے کی سچی تاریخ کو پیش کرتی ہے۔ اس کی اہمیت ایک اور اعتبار سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مصنف نے اسے بیان کر کے دنیا کے سامنے اپنے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ بھی پیش کر دیا ہے۔ مثلاً کتاب کے آخر میں میر فرماتے ہیں:

''(القصہ) یہ دنیا عجیب حادثہ گاہ ہے۔ کیسے کیسے مکان خراب ہوگئے اور کیسے کیسے جوان مر گئے، کیسے کیسے باغ ویران ہوگئے، کیسی محفلیں افسانہ ہوگئیں، کیسے پھول کمھلا گئے، کیسے جوان گزر گئے، کیسی مجلسیں اکھڑ گئیں، کیسے غافل کوچ کر گئے، کیسے عزیز خوار ہوئے اور کیسے لوگ بے اختیار ہوئے، اس غربت میں آنکھ نے کیا کیا دیکھا اور ان کانوں نے کیا کیا سن لیا۔ یہ دنیا ایک کہانی ہے جس کا کچھ حصہ ہم نے بیان کر دیا۔ جو باقی رہ گیا ہے وہ اب اور کوئی سنائے گا۔''

''عبرت وخاتمہ'' کے عنوان سے لکھا گیا کتاب کا یہ آخری حصہ دنیا کو یہ پیغام دیتا ہے کہ کسی بھی شئے کو ثبات نہیں، سب کچھ ختم ہو جانا ہے، یہ دنیا جائے عسرت ہے، اس لیے دنیا والوں کو چاہیے کہ وہ عبرت پکڑیں اور اپنی آخرت کی فکر کریں۔

میر نے یہ کتاب فارسی میں لکھی ہے اور اس زمانے کی زبان استعمال کی ہے جو مرصع ومقصع اور مسجع ہوا کرتی تھی۔ نثار احمد فاروقی نے جب اسے اردو میں منتقل کیا تو اس بات کا بھی پورا پورا خیال رکھا کہ فارسی زبان والا حسن اردو میں بھی برقرار رہے۔ یہاں کچھ نمونے درج کر دینا نامناسب نہیں رہے گا تا کہ میر کی فارسی نثر کا اردو کے قالب میں ڈھلا حسن ملاحظہ کیا سکے اور میرؔ اور میرؔ کے مترجم نثار احمد فاروقی کو جی کھول کر داد دی جاسکے۔

''...... بے عشق زندگی وبال ہے، عشق میں جی کی بازی لگا دینا کمال ہے، عشق بناتا ہے عشق ہی کندن کر دیتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے، آگ عشق کی سوزش ہے، پانی عشق کی رفتار ہے، خاک عشق کا قرار ہے، ہوا اس کا اضطراب ہے، موت عشق کی مستی، زندگی عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب اور دن عشق کی بیداری ہے، مسلمان عشق کا جمال ہے، کافر عشق کا جلال ہے، نیکی عشق کا قرب ہے، گناہ عشق کی دوری ہے، جنت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے، عشق کا مقام عبودیت وعارفیت وزاہدیت وصدیقیت وخلوصیت ومشافیت و خلیل وحبیب سے بہت بلند ہے۔''

''وہ عجیب زرد رخسار ہیں، عشق کے پرانے بیمار ہیں، مزاج کے ایسے غیور کہ جیسے دیکھنے کے لیے مرتے ہیں، اس سے صرف نظر کرتے ہیں، سر میں وہ پندار رکھتے ہیں کہ جب تک معشوق کی تیغِ ناز ہی نہ بٹھادے خود نہیں بیٹھتے، محبوب حقیقی کو جس سے وہ اتحاد رکھتے ہیں بہ کمال ذوق وشوق اسے دن رات تلاش کرتے ہیں۔''

مذکورہ اقتباسات میر کی نثاری اور نثار احمد فاروقی کی ترجمہ نگاری کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

4.3.3 ماحصل

میر کی خودنوشت ''ذکر میر'' دو پہلوؤں سے نہات وقیع ہے اول میر کے آباواجداد، ذاتی حالات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ دوم عہد میر کو سمجھنے میں یہ کتاب بنیادی طور پر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب محض میر کی آپ بیتی کی ہی ترجمان نہیں بلکہ جگ بیتی کو بھی پیش کرتی ہے۔ اس لیے اس کتاب کی اہمیت، افادیت اور معنویت محض ادبی حلقے تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک تاریخی حقائق کا منظرنامہ ہونے کی وجہ سے سیاسی، سماجی اور تاریخی حلقوں میں بھی سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب سے میر کی ان ترجیحات اور تصورات کا بھی علم ہوتا ہے جس سے ہمیں ان کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یقیناً تحریر بالخصوص خودنوشت شخصیت کے ذہنی ارتقا اور فکری ابعاد تک پہنچنے کا موثر اور دلچسپ وسیلہ ہے۔ جس میں شعوری اور غیر شعوری طور سے شخصیت کے تعمیری اور تخریبی دونوں طرح کے انعکاس نظر آتے ہیں۔ جس کے مطالعے کے بغیر نہ تو اس کے عہد کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی شخصیت کے کارناموں کو۔ لہٰذا یہ کتاب تفہیم میر کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- ''ذکر میرؔ'' کے محرکات واسباب سے واقفیت حاصل کی۔
- ''ذکر میرؔ'' کی اہمیت وافادیت اور اس کی معنویت سے آگہی حاصل کی۔
- عہد میرؔ کی سیاسی ومعاشرتی صورت حال کو جانا۔
- میرؔ کی زبان وبیان کی خوبیوں کو سمجھا۔
- میرؔ کی شخصیت کے امتیازی پہلوؤں کو جانا۔

4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ میر تقی میرؔ نے ''ذکر میر'' کس زبان میں لکھی تھی اور اسے کس نے شائع کیا؟

۲۔ ''ذکر میرؔ'' لکھنے کے کیا محرکات واسباب تھے؟ بیان کیجیے۔

۳۔ ذکر میرؔ کی قدر و قیمت کے متعلق خلیق انجم نے ''ذکر میر'' کے حرفِ آغاز میں کیا لکھا؟ مختصراً واضح کیجیے۔

۴۔ میرؔ نے اپنی خونوشت میں اپنے والد کی کن خوبیوں کا بہت زیادہ ذکر کیا ہے؟

۵۔ ''ذکر میرؔ'' آپ بیتی کم اور اپنے عہد کی جگ بیتی زیادہ کیوں کر معلوم ہوتی ہے؟ وضاحت کیجیے۔

4.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ یہ کتاب ''ذکر میر'' میرتقی میرؔ نے فارسی زبان میں لکھی تھی جسے مولوی عبدالحق نے اسے ۱۹۲۸ء میں مرتب کر کے اورنگ آباد سے شائع کیا۔

۲۔ ''ذکر میرؔ'' کے ''عرض مصنف'' کے ضمن میں میر نے بتایا ہے کہ بے کاری کے دنوں میں جب وہ گوشۂ تنہائی میں پڑے ہوئے تھے اور طرح طرح کے حوادث کا شکار تھے اسی وقت گوشۂ تنہائی میں پڑے پڑے انھوں نے اپنی سوانح لکھ ڈالی۔

۳۔ ''ذکر میرؔ'' کی قدر و قیمت کے متعلق خلیق انجم نے لکھا ہے کہ:

''یہ کام نثار احمد صاحب نے اتنی دقیقہ رسی اور ایسی محنت سے کیا کہ اب اسے ترجمے کی پہلی اشاعت سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ اسے بالکل نیا ترجمہ ہی سمجھنا چاہیے۔ سلیس، بامحاورہ اور شگفتہ بھی، وفادار بھی، کہیں کہیں تو فارسی اور اردو کی عبارتیں، لفظ و معنی اور اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے بالکل ایک جان دو قالب نظر آتی ہیں۔''

۴۔ میرؔ نے اس کتاب میں اپنے والد کے کلماتِ معرفت کا بیان بڑے شد و مد کے ساتھ کیا ہے اور اس نکتے پر زور دیا ہے کہ ان کے والد صاحب فرماتے تھے کہ کائنات کے تمام ذروں میں اسی آفتاب (خدا) کا عکس ہے۔ اگر تم اس کی ادا پہچان گئے تو تمہارا دل کامیاب ہے۔

۵۔ درانی کا حملہ، محمد شاہ کا انتقال، صفدر جنگ کی وزارت، غازی الدین خاں فیروز جنگ عالم گیر ثانی، راجا جگل کشور، راجا ناگرمل، ابدالی کے حملے، نجیب الدولہ سے جھڑپ، مرہٹوں کا فتنہ، دلّی میں لوٹ، جنگ پانی پت، ناگرمل کی نایبت، وزارتِ دلّی پھرلٹی، سورج مل کی بغاوت، میر قاسم کی معزولی، جواہر سنگھ اور مرہٹوں کی جنگ، سکھ فوج کی بدعہدی، جواہر سنگھ کا قتل، ضابطہ خاں پر چڑھائی، شاہ عالم اور مرہٹوں کی جنگ، نجف خاں کا اخراج، حسام الدین خاں کا حشر، جاٹوں سے جنگ، حافظ رحمت اللہ خاں کی شہادت، شجاع الدولہ کی وفات، نجف خاں کی وفات، نجف خاں کے جانشینوں میں رسا کشی، فرنگی سے

گٹھ جوڑ، شہزادہ جواں بخت، افراسیاب خاں کا قتل، مرہٹوں کا تسلط، راجپوتوں پر چڑھائی، غلام قادر خاں روہیلہ کے مظالم وغیرہ ان عنوانات سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ میر کی خودنوشت ''ذکرِ میر'' میں آپ بیتی کم ہے اور ان کے عہد کی جگ بیتی زیادہ ہے۔

4.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
خودنوشت	:	آپ بیتی
اعتراف	:	کسی کی حقیقت یا برتری کو مان لینا، تسلیم کرنا
طبع اوّل	:	پہلی اشاعت
طبع ثانی	:	دوسری اشاعت
قلمی نسخہ	:	ہاتھ سے لکھا ہوا کسی کتاب کا مسودہ
منتقل کرنا	:	ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں کسی فن پارے کو منتقل کرنا
سرگذشت	:	روداد، کہانی
عبرت	:	کسی بات یا واقعے سے سبق لینا
صوفی منش	:	صوفیانہ مزاج رکھنے والا انسان، بزرگ
اسفار	:	سفر کی جمع
دشوارکن	:	مشکل
بے وقعت	:	جس کی وقعت یا حیثیت نہ ہو
صعوبت	:	سفر کی تکلیف، مصیبت
اقتدار	:	ستّا، حکومت
اقامت اختیار کرنا	:	سکونت اختیار کرنا، کسی مقام پر ٹھہر جانا
کلماتِ معرفت	:	معرفت کی باتیں، یعنی وہ باتیں جو انسان کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں

4.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	ذکر میر (فارسی)	:	میر تقی میرؔ
۲۔	میر کی آپ بیتی (ذکر میر کا اردو ترجمہ)	:	نثار احمد فاروقی
۳۔	میر تقی میرؔ	:	نثار احمد فاروقی
۴۔	نقدِ میر	:	سید عبداللہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 5 میر تقی میرؔ کے نمائندہ معاصرین

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 میرؔ کے نمائندہ معاصرین

5.3.1 مرزا مظہرؔ جانِ جاناں

5.3.2 انعام اللہ خاں یقینؔ

5.3.3 خواجہ احسن الدین خاں بیانؔ

5.3.4 میر محمد باقر حزیںؔ

5.3.5 میر عبدالحئی تاباںؔ

5.3.6 اشرف علی خاں فغاںؔ

5.3.7 مرزا محمد رفیع سوداؔ

5.3.8 خواجہ میر دردؔ

5.3.9 محمد قیام الدین قائمؔ چاند پوری

5.3.10 محمد میر سوزؔ

5.3.11 خواجہ محمد میر اثرؔ دہلوی

5.3.12 میر غلام حسنؔ دہلوی

5.3.13 ماحصل

5.4 آپ نے کیا سیکھا؟

5.5 اپنا امتحان خود لیجیے

5.6 سوالوں کے جوابات

5.7 فرہنگ

5.8 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میر تقی میرؔ کے نمائندہ معاصرین کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کے نمائندہ معاصرین کی ادبی خدمات سے متعارف ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کے نمائندہ معاصرین کے کلام کی فکری وفنی خوبیوں سے روشناس ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کے نمائندہ معاصرین کے مقام ومرتبہ کی معلومات حاصل کریں گے۔
- میر تقی میرؔ کے عہد کی شاعری سے متعارف ہوں گے۔

5.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر کی خودنوشت ''ذکر میر'' کا مطالعہ کر کے میر کے ذاتی حال واحوال اور جگ بیتی سے واقفیت حاصل کی۔ اب آپ زیرِ نظر اکائی میں میر تقی میر کے نمائندہ معاصرین کا مطالعہ کریں گے۔ یقیناً آپ جانتے ہوں گے کہ عہدِ میرؔ کو اردو شاعری کا عہدِ زریں کہا گیا ہے۔ اس دور میں بیک وقت اتنے باکمال شعرا اور ادبا جمع ہو گئے تھے کہ اس سے قبل اور بعد کے دور میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان شخصیات نے جملہ اصنافِ سخن کو ترقی دے کر بامِ عروج تک پہنچایا۔ درحقیقت ان باکمال حضرات نے اردو زبان وادب اور شعر وسخن کو نہ صرف ایک معیار عطا کیا بلکہ اردو شاعری کو ادبیاتِ عالم میں ایک نمایاں مقام تک پہنچایا ہے۔ لٰہذا آپ اس اکائی میں میر کے نمائندہ معاصرین مثلاً: مرزا مظہر جانِ جاناں، انعام اللہ خاں یقین، احسن الدین بیانؔ، میر محمد باقر حزیں، میر عبدالحیٔ تاباںؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، محمد میر سوزؔ، شیخ قیام الدین قائمؔ، میر غلام حسن وغیرہ کو پڑھیں گے۔

5.3 میر تقی میرؔ کے نمائندہ معاصرین

5.3.1 مرزا مظہرؔ جانِ جاناں (۱۱۱۰ھ/ ۳؍مارچ ۱۶۹۹ء تا ۱۰؍محرم ۱۱۹۵ھ/ ۷؍جنوری ۱۷۸۱ء)

عزیز طلبا! میر کے معاصرین کی ایک طویل فہرست ہے۔ جن کا ذکر مختلف تذکروں میں ملتا ہے مثلاً: مرزا مظہرؔ جانِ جاناں، انعام اللہ خاں یقیںؔ، احسن الدین بیانؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، میر عبدالحیٔ تاباںؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، محمد میر سوزؔ، شیخ قیام الدین قائمؔ، میر غلام حسن حسنؔ، میر محمد حسین کلیم، میر محمدی بیدار، سید محمد میر اثرؔ، جعفر علی حسرتؔ، شاہ ہدایت اللہ ہدایتؔ، میر ضیاء الدین ضیاؔ، شاہ قدرت اللہ قدرتؔ، بندرا

بن راقمؔ، شیخ بقاء اللہ بقاؔ، میر عبدالرسول نثارؔ، محمد محسن محسنؔ، ثناء اللہ فراقؔ، میر قمرالدین منتؔ، شیخ ولی اللہ محبؔ، مرزا عظیم بیگ عظیمؔ، محمد فقیہ دردمندؔ، کرم اللہ خاں دردؔ، مرزا جان طپشؔ، مرزا محمد یار خاکسارؔ، نواب محمد یار خاں امیرؔ، نواب مہربان خاں رندؔ، آفتاب رائے رسواؔ، لالہ نول رائے وفاؔ، لالہ خوش وقت رائے شادابؔ، سنتوکھ رائے بیتابؔ، میر غلام حسین ضاحکؔ، فدوی لاہوری، میاں سکندرؔ، رائے سرب سنگھ دیوانہ، بساون لال بیدارؔ، ہیبت قلی خاں حسرتؔ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے نمایاں اور اہم شعرا کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے:

نام جانِ جاناں تخلص مظہرؔ اور لقب شمس الدین حبیب اللہ تھا۔ عوام الناس کے درمیان جان جانان کے نام سے شہرت پائی۔ ان کے والد مرزا جان جانیؔ عہدِ عالمگیری میں منصب دار اور فارسی کے شاعر تھے۔ اورنگ زیب کی دکن کی مہم کے دوران انھوں نے ملازمت ترک دی اور اپنے وطن آگرہ کی راہ لی۔ راستے ہی میں کالاباغ (مالوہ) کے مقام پر ۱۱ رمضان المبارک شبِ جمعہ ۱۱۱۰ھ/۳ر مارچ ۱۶۹۹ء کو مرزا مظہر جانِ جاناں پیدا ہوئے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے نام سے متعلق ایک دلچسپ وضاحت کی ہے۔ وہ یہ کہ ان کا نام و تخلص گویا ترجمانِ اسرارِ الٰہی مولانا روم کا عطیہ ہے کہ آج سے پانچ سو سال قبل مثنوی کے دفترِ ششم میں ارشاد فرما گئے ہیں اور بعد میں آنے والوں کی انجمن کے لیے ایک نمایاں کرامت پیش کر گئے ہیں۔ یعنی:

جانِ اول مظہرِ درگاہ شد

جانِ جان خود مظہرِ اللہ شد

مرزا مظہر جانِ جاناں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت آگرہ ہی میں ہوئی۔ ان کا لڑکپن آگرہ ہی میں بسر ہوا۔ ابھی صرف اپنے عمر کے اٹھارہویں پڑاو پر ہی تھے کہ ۱۷۱۷ء میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ بعد میں انھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ تیس برس تک مدرسوں اور خانقاہوں میں دینی علوم حاصل کرتے رہے۔ مذہبی علوم کے علاوہ فنِ سپہ گری میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے ایک بڑے درویش عالم اور صاحبِ کمال تھے۔ قناعت پسند انسان تھے۔ فقر و استغنا ان کے خمیر میں داخل تھا۔ امرا اور بادشاہوں کی نذریں عموماً قبول نہیں کرتے تھے۔ جب تک باحیات رہے فقیرانہ زندگی بسر کی۔ خوش تقریر ایسے کہ بیان سے باہر ہے۔ شعر پڑھنے کا انداز بہت پرکشش تھا۔ آدابِ معاشرت، حسنِ سلوک، مراتبِ فضل و شعر میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ خوش قماش شخص تھے اور طبیعت میں ایک طرح کی نازکی تھی۔ شریعت و طریقت اور کتاب و سنت کی پیروی میں ثابت قدم تھے۔ عشق ان کے خمیر میں داخل تھا۔ اسی عشق نے آگے چل کر عشقِ حقیقی کا روپ دھار لیا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے نئی نسل کے شعرا کو ایہام گوئی سے ہٹا کر فطری اور حقیقی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں ۷ محرم الحرام کو ان پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ۱۰ر محرم ۱۱۹۵ھ/۷ر جنوری ۱۷۸۱ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مرزا مظہر جان جاناں نے درج ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں:

دیوانِ فارسی، خریطۂ جواہر، مکاتیبِ نثر وغیرہ۔ ان کا اردو میں باقاعدہ کوئی دیوان نہیں ہے۔ ہاں مختلف تذکروں میں درج ان کے اردو کلام کو عبدالرزاق قریشی نے یکجا کر دیا ہے۔ ان کے اب تک صرف ۱۲۴ اشعار دریافت ہو سکے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں دہلی کے خاص محاوروں کا استعمال نہایت خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ انھوں نے عشقیہ واردات اور جذبات و احساسات کو اپنی شاعری میں بہ حسن و خوبی برتا ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اردو شاعری کی تاریخ میں اس لیے اہم ہیں کہ انھوں نے اردو شاعری میں ایہام گوئی کو رد کیا اور اسے ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ زبان میں شستگی، شائستگی اور بیان میں حلاوت، قلبی واردات اور تجربات شامل کیے جانے لگے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، بساون لال بیدارؔ اور خواجہ احسن الدین خاں بیانؔ اپنے وقت کے مشہور اساتذہ میں شامل تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

5.3.2 انعام اللہ خاں یقینؔ (۱۷۲۷ء تا ۱۷۵۵ء)

انعام اللہ خاں نام اور یقینؔ تخلص تھا۔ دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ اظہر الدین تھا۔ محمد شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ دادا کا نام شیخ عبدالاحد تھا۔ جو شاہ وحدت کے نام سے مشہور تھے اور گلؔ ان کا تخلص تھا۔ ان کی والدہ نواب حمید الدین خاں کی بیٹی تھیں۔ متعدد تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یقینؔ کو ان کے والد ہی نے عین نوجوانی میں قتل کرا دیا۔ درحقیقت یقینؔ کی موت ایک ایسا سربستہ راز ہے جس سے کبھی پردہ نہیں اٹھ سکا۔ وہ ایک وجیہ و شکیل اور خوب رو، خوش اخلاق انسان تھے۔ افیون کثرت سے استعمال کرتے۔ یقینؔ شاعری میں مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ ان کو اپنی زندگی ہی میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کی زمین میں شاہ حاتمؔ نے متعدد غزلیں کہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں فارسی کا اثر اور ان کا اپنا ذاتی تجربہ ایک نیا رنگ پیدا کرتا ہے۔ ان کی زبان میں ایک شگفتگی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ وہ دلی کی بامحاورہ ٹکسالی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ شوخی اور طرزِ ادا ان کے کلام میں ایک دل کشی پیدا کرتی ہے۔ ان کا دیوان بہت مختصر ہے۔ اس میں محض ایک سو ستر غزلیں ہیں اور سب کی سب پانچ پانچ اشعار پر مبنی ہیں۔ ان کی غزلوں میں جوش و ولولہ خاص طور پر نمایاں ہے۔ یقینؔ کی غزلوں میں احساس و معنی، بندشِ الفاظ اور الفاظ کا باہمی ربط، ان کا لب ولہجہ اس دور کے لیے بالکل نیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی زبان آج کی زبان سے قریب تر ہے۔ یقینؔ کے لب و لہجے نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے متعارف کرایا۔ ان کی شاعری میں جذبات و احساسات کی ترجمانی ہے۔ نئی نسل کے شعرا کے لیے یقینؔ کی شاعری ایک نمونہ بن گئی۔ ان کے بعد آنے والے مختلف شعرا نے ان سے اثر قبول کیا۔

5.3.3 خواجہ احسن الدین خاں بیانؔ (وفات: ۱۲۱۳ھ/ جولائی یا اگست ۱۷۹۸ء)

خواجہ احسن الدین خاں نام اور تخلص بیانؔ تھا۔ قائم چاند پوری نے مخزنِ نکات میں، گردیزی نے تذکرۂ ریختہ گویاں میں اور میر حسنؔ نے تذکرہ شعرائے اردو میں اگر چہ بیانؔ کا نام 'خواجہ احسن اللہ' لکھا ہے جب کہ حیرت نے 'مقالاتِ شعرا' میں، یکتا نے 'دستور الفصاحت' میں، قاسم نے 'مجموعۂ نغز' میں اور مصحفیؔ نے 'تذکرۂ ہندی' میں ''خواجہ احسن الدین خاں' تحریر کیا ہے۔ جمیل جالبی نے ''تاریخِ ادب اردو'' میں بیان کا نام ''خواجہ احسن الدین خاں'' ہی تسلیم کیا ہے اور یہی نام حقیقت کے قریب تر ہے۔ بیانؔ کشمیری النسل تھے۔ بعد میں ان کے اجداد نے آگرہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ وہ آگرہ ہی میں پیدا ہوئے اور دہلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ مولانا فخر الدین دہلوی کے مریدوں میں سے تھے۔ سنہ پیدائش معلوم نہیں۔ انعام اللہ خاں یقیںؔ کے ہم عمر تھے۔ جس زمانے میں بیانؔ نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اس وقت مرزا مظہر جانِ جاناں اور انعام اللہ خاں یقیںؔ کی شہرت اپنی بلندیوں پر تھی۔ بیانؔ بھی مظہرؔ کے شاگرد اور اشرف علی خاں فغاںؔ کی مصاحبوں میں سے تھے۔ لیکن احمد شاہ کی معزولی کے بعد جب فغاںؔ مرشد آباد چلے گئے تو بیانؔ بے روزگار ہو گئے۔ ایک عرصے کے بعد بیانؔ غازی الدین خاں عماد الملک سے وابستہ ہوئے۔ عماد الملک کے ساتھ یہ وابستگی ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء تک رہی۔ اسی سال بیانؔ نے عماد الملک کے ساتھ سورت تک کا سفر کیا۔ وہاں سے عماد الملک حج کے لیے روانہ ہوئے۔ بیان نے سورت سے حیدر آباد دکن کی راہ لی اور ایک مدت کے انتظار کے بعد نظام علی خاں آصف جاہ ثانی سے وابستہ ہو گئے۔ ماہِ صفر المظفر بروزِ جمعہ ۱۲۱۳ھ/ جولائی/ اگست ۱۷۹۸ء میں بیانؔ کا انتقال ہوا۔ حیدر آباد ہی میں دفن ہوئے۔ ان کے شاگرد رائے گلاب چند ہمدمؔ نے قطعہ تاریخِ وفات لکھا اور ''استاد از جہان رفت'' سے تاریخِ وفات (۱۲۱۳ھ) نکالی۔

بیانؔ خوب صورت، خوب سیرت اور نہایت خوش خلق انسان تھے۔ فہم و فراست اور دانائی ان کے اندر پائی جاتی تھی۔ بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ علمِ صرف و نحو کی باضابطہ انھوں نے تعلیم پائی تھی۔ لہٰذا فنِ شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فصیح البیان بھی تھے اور صاحبِ زبان بھی تھے۔ فارسی زبان و ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور زبان و بیان کے تعلق سے کافی محتاط رہتے تھے۔ فکری اور فنی سطح پر بیانؔ کے یہاں فارسی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم انھوں نے اپنی شاعری میں عام بول چال کی زبان اور لب و لہجہ کو اپنایا ہے۔ غزل گوئی میں ان کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ کم گو تھے۔ ایک مختصر دیوان ان کی یادگار ہے۔ دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصائد، مثنوی، رباعیات، مسدس، مخمس، نعت اور مرثیے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

جھانک ٹک داغِ دل میں اپنے بیاںؔ — اس چمن میں بھی کم بہار نہیں
آتا تھا کچھ ہمیں بھی کبھو شعر یا سخن — اب تو کسی کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا
اشک یوں تھم رہا ہے مژگاں پر — کوئی موتی پرو نہیں سکتا

5.3.4 میر محمد باقر حزیںؔ (وفات: ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء)

حزیںؔ کے والد کا نام فخر اللہ خاں تھا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے خاص شاگرد تھے۔ والد کی شہادت کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) سے شاہجہان آباد (دہلی) پہنچے اور خواجہ محمدی خاں حریف سے متوسل ہو گئے۔ جب نادر شاہ نے دہلی کو تاخت وتاراج کیا تو دہلی سے براہِ لکھنؤ عظیم آباد پہنچے۔ یہاں انھوں نے نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ کی ملازمت اختیار کی۔ یہیں پر شاہ شکر اللہ کی بیٹی میر قدرت اللہ کی بہن سے شادی ہوئی۔ عظیم آباد سے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کا سفر کیا۔ یہاں انھوں نے حزیںؔ کے بجائے ظہورؔ اپنا تخلص رکھ لیا۔ یہیں انھوں نے ایک ساقی نامہ لکھا اور ایک دیوان ترتیب دیا۔ بالآخر نواب صولت جنگ کے ہمراہ ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء میں میر محمد وحید کی خدمت میں پورنیہ پہنچے۔ یہیں ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں موت کی آغوش میں سو گئے۔ شورشؔ عظیم آبادی، حسرتؔ عظیم آبادی اور ظہور عظیم آبادی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان کی زبان میں شگفتگی اور تازگی پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان اردوئے معلیٰ کی زبان ہے۔ منجملہ وہ دوسرے درجے کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں یقیںؔ اور تاباںؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی شاعری ایہام گوئی کے ردِعمل کی تحریک کے زیرِ سایہ پروان چڑھی۔ انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ حزیںؔ نے یقیںؔ کے دیوان کے جواب میں اپنا دیوان ترتیب دیا۔ دیوانِ حزیںؔ کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے بیشتر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

نہ ہوتا اس قدر خوباں میں گر وہ تندخو نازک	تو کب ہوتی ہماری شاعری کی گفتگو نازک
عاشقوں کے دل میں کب ہے صبر کی طاقت حزیں	نوحہ کرنے میں نہیں ان بے قراروں کا گناہ

5.3.5 میر عبدالحئی تاباںؔ (۱۷۱۸ء تا ۱۷۴۹ء-۱۷۵۲ء)

تاباںؔ دلی کے رہنے والے تھے۔ کثرتِ شراب نوشی کے باعث ان کی موت واقع ہوئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ مختلف تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کے حسن و جمال کے قصیدے پڑھے ہیں لیکن ان کی سنہ پیدائش، سنہ وفات اور تعلیم وتربیت کے موضوع پر ان کا قلم بالکل خاموش ہے۔ ڈاکٹر ثناء الحق نے اپنی کتاب ''میر وسودا کا دور'' میں یہ قیاس کیا ہے کہ تاباںؔ عہدِ فرخ سیر میں ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ تاباںؔ کے کلام سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عربی اور فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ عربی اور فارسی کے علاوہ دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ تاباں کے تلمذ کے بارے میں کافی اختلافات ہیں۔ ابتدا میں وہ شاہ حاتمؔ کے شاگرد رہے۔ بعد میں ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء کے آس پاس محمد علی حشمت سے مشورۂ سخن لینے لگے۔ تاباںؔ نے ۱۷۴۹ء اور ۱۷۵۲ء کے درمیان وفات پائی۔

تاباںؔ نے اپنی شاعری میں فارسی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے اظہار کی سطح پر عام بول چال کی زبان سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ ان کے کلام میں فارسی ترکیبوں کا استعمال برائے نام ہے۔ ان کے لب و لہجے میں اردو پن نمایاں ہے۔ مختصر یہ کہ تاباںؔ نے اپنے جذبات و احساسات اور قلبی واردات کو شاہجہان آباد کی ٹکسالی زبان کے توسط سے شاعری کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ وہ اردو شاعری کی روایت کے پاس دار ہیں۔ ان کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ رباعیات، قطعات، مثلث، مخمس، مسدس، ترکیب بند، تضمین، مستزاد، قصیدہ، مثنوی اور قطعاتِ تاریخِ وفات بھی شامل ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:

نہ طاقت ہے اشارے کی نہ کہنے کی نہ سننے کی
کہوں کیا میں سنوں کیا میں بتاؤں کیا بیاں اپنا

خزاں تک تو رہنے دے صیاد ہم کو
کہاں یہ چمن پھر کہاں آشیانہ

بلبلو! کیا کرو گے اب چھٹ کر
گلستاں تو اجڑ چکا کب کا

ہوتے ہیں مفت جان کے دشمن یہ خوب رو
اقرار سے اس عشق کے انکار ہی بھلا

عجب احوال ہے تاباںؔ کا میرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

آئی بہار شورشِ طفلاں کو کیا ہوا
اہلِ جنوں کدھر گئے یاراں کو کیا ہوا

سبب جو میری شہادت کا یار سے پوچھا
کہا کہ اب تو اسے گاڑ دو ہوا سو ہوا

قفس میں بند ہیں یہ عندلیبیں سخت بے بس ہیں
نہ گلشن دیکھ سکتی ہیں نہ یہ اب آشیاں اپنا

5.3.6 اشرف علی خاں فغاںؔ (۲۶-۱۷۲۵ء تا ۷۳-۱۷۷۲ء)

اشرف علی خاں فغاں ''ظریف الملک کوکہ خاں بہادر مصاحب الدولہ یک تاز جنگ'' عہدِ میر کے ایک قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ اشرف علی خاں نام اور فغاںؔ تخلص تھا۔ ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء میں جب احمد شاہ تخت نشین ہوا تو انھیں ''پنج ہزاری منصب'' اور ''کوکہ خاں'' کا خطاب عطا کیا۔ فغاںؔ کی والدہ نے محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کو دودھ پلایا تھا۔ اس اعتبار سے فغاں بادشاہ احمد شاہ کے رضاعی بھائی تھے۔ اس طرح مغلیہ دربار سے فغاں کی بڑی گہری وابستگی تھی۔ خوش طبعی اور ظرافت میں ان کا کوئی مدِ مقابل نہیں تھا۔ اگر چہ ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا محال ہے لیکن جمیل جالبی نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۱۳۸ھ/ ۲۶-۱۷۲۵ء کے آس پاس متعین کی ہے۔ جب عماد الملک نے ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو معزول کر کے عالمگیر ثانی کو تخت پر بیٹھا دیا تو فغاں بھی اپنی جان بچا کر مرشد آباد پہنچے۔ وہاں ان کے چچا ایرج خاں نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ دل برداشتہ ہو کر فیض آباد آئے۔ یہاں وہ نواب شجاع الدولہ کی دربار سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن شجاع الدولہ نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اب فغاںؔ فیض آباد سے عظیم آباد پہنچے۔ وہاں راجہ شتاب رائے نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ راجہ صاحب کی سفارش پر شاہ عالم بادشاہ نے فغاں کو 'ظریف الملک' کا خطاب اور دو تین گاؤں

جاگیر میں دیے۔ یہیں عظیم آباد میں ۱۱۸۶ھ/۷۳-۱۷۷۲ء میں فغاں کا انتقال ہوگیا۔ وہ عظیم آباد کے محلّہ ڈھول پورہ، شیر شاہ کی مسجد کے قریب آغا حسینا کے چوراہے سے متصل باون برج کے امام باڑے کے صحن میں دفن ہوئے۔

فغاں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن انھیں شہرت و مقبولیت ریختہ گوئی سے حاصل ہوئی۔ ان کے کلیات میں تقریباً دو ہزار اشعار شامل ہے۔ کلیات کا انتخاب ''دیوانِ فغاں'' کے نام سے موجود ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ فارسی میں فغاں قزلباش خاں امید سے اصلاحِ سخن لیتے تھے اور اردو شاعری میں علی قلی خاں ندیم کے شاگرد تھے۔ فغاں نے فارسی اور ہندی کے محاوروں کو اپنے کلام میں بخوبی برتا ہے۔ اگر چہ ان کے کلام میں گہرائی نہیں تاہم اس میں ایک طرح کی انفرادیت، کلام میں پاکیزگی اور مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ فغاں فارسی الفاظ وتراکیب اور بندشوں کے ذریعے اپنی بات کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ الفاظ کو بڑے سلیقے سے شاعری کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ وہ سنگلاخ زمینوں میں بھی بڑی بے ساختگی کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ عشق اور متعلقاتِ عشق فغاں کی شاعری کا محور ہے۔ انھوں نے فارسی روایات کی پیروی کرتے ہوئے شاعری کی تخلیقی قوت، اسلوب اور خیال، جذبات واحساسات اور وارداتِ قلبی کو ایک نئی زبان کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

فغاں ریختہ گو جہاں میں بہت ہیں کوئی تجھ سا دنیا میں پیدا نہ ہوگا
تو بھی حیرت میں رہا دیکھ کے آئینے کو جو تجھے دیکھ کے حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا
جدائی میں اگر آنکھیں نہ روتیں تو ہرگز رازِ دل افشا نہ ہوتا
آخر اس منزلِ ہستی سے سفر کرنا ہے اے مسافر تجھے چلنے کی خبر ہے کہ نہیں
شبِ فراق میں اکثر میں آئینہ لے کر یہ دیکھتا ہوں کہ آنکھوں میں خواب آتا ہے
پھرا نہ راہِ عدم سے کوئی کہ ہم پوچھیں مسافرو کہو منزل پہ کیا گزرتی ہے

5.3.7 مرزا محمد رفیع سودا (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء تا ۴/رجب ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء)

مرزا محمد رفیع نام اور سودا تخلص تھا۔ میر کے معاصرین میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ اگر چہ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی اصل شہرت اور مقبولیت کی وجہ ان کی قصیدہ نگاری ہے۔ انھوں نے اردو قصیدے کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک سودا کے آباواجداد کا تعلق کابل سے تھا۔ لیکن بھگوان داس ہندی کے تذکرے ''سفینۂ ہندی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے سودا کے بزرگوں کا وطن بخارا ہی بتایا ہے۔ اگر چہ سودا کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا لیکن ان کے والد مرزا شفیع نے سپہ گری کے پیشے کو نہ اپنا کر تجارت کا

پیشہ اختیار کیا۔ ان کا شمار دہلی کے بڑے تاجروں میں ہوا کرتا تھا۔ والد کی وفات کے بعد سودا کو جو ترکہ ملا اسے انھوں نے دوست نوازی میں خرچ کر دیا۔ سودا دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ عہدِ وسطی کی دہلی میں جہاں کابلی دروازہ ہوا کرتا تھا، اس کے گردو نواح میں ایک گنجان آبادی تھی۔ سوؔدا کا آبائی مکان وہیں ہوا کرتا تھا۔ اب نہ وہ کابلی دروازہ ہے اور نہ اس کے ارد گرد جو مکانات تھے ان کی باقیات۔ سودا کی تعلیم و تربیت روایتی انداز میں ہوئی۔ انھوں نے فارسی زبان و ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ بڑی حد تک عربی زبان و ادب سے واقفیت رکھتے تھے۔

شروع میں سوؔدا نے گزراوقات کے لیے فوج میں نوکری کر لی۔ لیکن ان کو سپہ گری کا پیشہ راس نہیں آیا۔ انھوں نے اسے ترک کر کے ملازمت و مصاحبت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ خاندانی اعزاز اور اپنی قابلیت کی بنیاد پر انھوں نے بادشاہوں اور امرا کی قربت حاصل کر لی۔ سوؔدا کو کتے پالنے اور موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ سوؔدا مختلف سرکاروں اور درباروں سے وابستہ رہے۔ پہلے انھوں نے محمد شاہ کے خواجہ سرا بسنت علی خاں کی مصاحبت اختیار کی، بعد ازیں سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر کی قربت اختیار کی، پھر نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۷۶۲ء میں سوؔدا عماد الملک کے ساتھ دہلی سے فرخ آباد پہنچے اور وہاں انھوں نے مہربان خاں رند کی مصاحبت اختیار کر لی۔ ۱۷۶۹ء تک سوؔدا فرخ آباد میں مقیم رہے۔ اس کے بعد انھوں نے فیض آباد کی راہ لی اور نواب شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ نواب نے ۲۰۰ روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا اور خلعت بخشا۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ اودھ کے فرماں روا ہوئے۔ آصف الدولہ نے چھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر بخشی۔ جب اودھ کا پائے تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا تو سوؔدا بھی نواب آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ یہیں آموں کی فصل میں آم کھانے سے بیمار پڑے اور ۱۷ رجون ۱۷۸۱ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور آغا امام باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔

سودا نے اپنی پوری زندگی ملازمت و مصاحبت میں بسر کی۔ آدابِ مجلس سے کما حقہ واقف تھے۔ وہ جس دربار سے بھی وابستہ ہوئے وہاں انھوں نے اپنی جگہ بنا لی۔ نہایت خوش خلق، یار باش، شگفتہ رو، شیریں زبان، دوست نواز، وضع دار، شریف النفس اور ظریف الطبع انسان تھے۔ اگر چہ ان کی ہجو گوئی بامِ عروج پر تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی عاجزی اور انکساری ان کے سرشت میں داخل تھی۔ گرم جوشی ان کی فطرت میں تھی۔

ہر بات ہے لطیفہ و ہر اک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں
(سوؔدا)

سوؔدا ان تمام اوصاف سے قطع نظر اپنی ہجویہ شاعری میں بہت جلد رنجیدہ اور غصے سے آگ بگولا ہو جانے والے انسان نظر آتے ہیں۔ وہ جب کسی سے ناراض ہوتے تو فوراً اپنے غلام غنچہ سے کہتے: ''غنچہ لانا تو میرا قلمدان! ذرا

میں اس کی خبر لوں''۔سوداؔ ایک صاحبِ کمال غزل گو بھی تھے لیکن اردو قصیدہ نگاری میں ان کو جو شہرت و مقبولیت ملی وہ غزل گوئی میں نہیں مل سکی۔قصیدہ نگاری میں سوداؔ کا نام سرفہرست ہے۔ان کا کوئی ہم سر نہیں۔میر تقی میرؔ نے انھیں 'نکات الشعرا' میں 'سر آمد شعرائے ہندی' کہا ہے۔میر حسنؔ نے 'تذکرہ شعرائے ہندی' میں قصیدہ وہجو میں انھیں 'صاحبِ ید بیضا' بتایا ہے۔لکشمی نرائن شفیق نے 'تذکرہ چمنستانِ شعرا' میں ان کے صریرِ کلک کو 'ہمدمِ اعجازِ مسیحا' لکھا ہے۔مصحفی نے 'تذکرۂ ہندی' میں 'قصیدہ کا نقاشِ اول' بتایا ہے۔مرزا علی لطف نے 'تذکرہ گلشنِ ہند' میں یہ لکھا ہے کہ 'قصیدہ تو ختم ہی مرزا سودا پر ہوا'۔

سوداؔ کی ادبی زندگی کا آغاز فارسی شاعری سے ہوا لیکن بعد میں سراج الدین علی خاں آرزو کے مشورے سے ریختہ گوئی کی طرف اپنی توجہ پوری طرح مبذول کر لی۔وہ فارسی میں سراج الدین علی خاں آرزوؔ سے اور اردو میں شاہ حاتم سے مشورہ لیا کرتے تھے۔شاہ حاتم کو سوداؔ پر بڑا فخر تھا۔قصیدہ نگاری کو سوداؔ نے معراجِ کمال تک پہنچایا۔اس کے تمام اجزائے ترکیبی کو اپنے قصیدوں میں بڑے سلیقے سے برتا۔قصیدہ نگاری کے لیے ان کا اسلوب نہایت موزوں تھا۔ان کے قصیدوں میں زورِ بیان بھی ہے اور بلند آہنگی بھی۔پُر شکوہ لب ولہجہ، مضمون آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنا ان کے اسلوبِ نگارش کے اہم پہلو ہیں۔کہا جاتا ہے کہ مرثیہ کو مسدس کی ہئیت سوداؔ ہی نے عطا کی۔سوداؔ کو اپنی قصیدہ گوئی پر بہت ناز تھا۔انھوں نے خود کو انوری، سعدی اور خاقانی کے مدِ مقابل قرار دیا ہے:

انوری، سعدی و خاقانی و مداح ترا
رتبۂ شعر وسخن میں ہیں بہم چاروں ایک
(سوداؔ)

سوداؔ کے قصائد کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔اول وہ قصائد جو بزرگانِ دین کی شان میں لکھے گئے۔دوم وہ قصائد جو انھوں نے اپنے سر پرست امرا، محسنین اور مصاحبین اور مربیوں کی شان میں مدح سرائی کی۔مثلاً: بسنت خاں خواجہ سرا، عالم گیر ثانی، مہربان خاں رند، احمد خاں بنگش، نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ، رچرڈ جانسن ریزیڈنٹ لکھنؤ وغیرہ وغیرہ۔

سوداؔ نے اپنی شاعری میں اپنے دیگر معاصرین کے مقابلے اپنے دور کی بہترین ترجمانی کی ہے۔وہ ایک پُر گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ان کے اپنے کچھ معاصرین میر تقی میر اور میر ضاحک سے معرکہ آرائیاں بھی رہیں۔لیکن انھوں نے دوستی اور پرانے مراسم کا پاس ولحاظ ہمیشہ قائم رکھا۔وہ ایک فراخ دل انسان تھے۔دوسروں کی معرکہ آرائیوں کو نظر انداز کرنا بھی جانتے تھے۔اگر چہ ان کے کردار میں پیچیدگی تھی لیکن بحیثیت مجموعی وہ دنیا میں رہنا اور نباہ کرنا جانتے تھے۔سوداؔ کی درج ذیل اہم تصانیف ہیں:

نثری تصانیف:

۱۔ مثنوی سبیلِ ہدایت کا اردو دیباچہ ۲۔ مثنوی عبرت الغافلین کا فارسی دیباچہ
۳۔ شعلۂ عشق اردو نثر ۴۔ تذکرۂ شعرا

شعری تصانیف:

۵۔ دیوانِ غزلیاتِ اردو ۶۔ دیوانِ قصائد ہجویات و مراثی وغیرہ
۷۔ دیوانِ فارسی

5.3.8 خواجہ میر دردؔ (۱۷۲۱ء تا ۷/جنوری ۱۷۸۵ء)

خواجہ میر نام اور دردؔ تخلص تھا۔ میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کے بعد دردؔ اس عہد کے تیسرے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ ان کے بزرگ اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں بخارا سے ہندوستان آئے۔ ان کا گھرانہ ایک صوفی گھرانہ تھا۔ ان کے پدرِ بزرگوار کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور شاعری میں عندلیبؔ تخلص رکھتے تھے۔ خواجہ میر نے عندلیبؔ کی رعایت سے اپنا تخلص دردؔ رکھا۔ ایک فارسی غزل کے مقطع میں بھی اس جانب دردؔ نے اشارہ کیا ہے:

دردؔ از بس عندلیبِ گلشنِ وحدت شدہ است
جلوۂ روئے گلِ او را غزل خوان می کند

خواجہ میر دردؔ حسینی سید تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے حضرت بہاؤ الدین نقشبندیؒ سے اور ماں کی طرف سے سید عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔ میر دردؔ ۱۷۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کی روایت کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں علم و فضل بھی تھا اور حقیقت، طریقت، معرفت اور سلوک کے مشاہدات بھی۔ چوں کہ ان کا گھرانہ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ لہٰذا کم سنی ہی سے میر دردؔ کو علم و ادب سے ایک گہری وابستگی ہوگئی۔ وہ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ذہانت اور ذکاوت میر دردؔ میں خداداد تھی۔ انھوں نے قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور تصوف کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ پندرہ برس کے سن میں ایک رسالہ 'اسرار الصلوٰۃ' فارسی زبان میں تصنیف کر چکے تھے۔ تصوف اور شاعری دردؔ کو ورثے میں ملی تھی۔ اسی زمانے میں دردؔ نے اردو اور فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ فنِ موسیقی سے بھی درد کو کافی رغبت تھی۔ ۲۹ سال کی عمر میں دردؔ نے 'وارداتِ درد' نام کا ایک اور رسالہ لکھا۔ نوجوانی میں سپہ گری بھی اختیار کی لیکن جلد ہی والد بزرگوار کے ایما پر اس پیشے سے دست بردار ہو گئے اور درویشی اختیار کر لی۔ اگرچہ نقشبندیہ سلسلے میں سماع ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن پھر بھی وہ ذوقِ موسیقی کو ترک نہ کر سکے۔ وہ

ذوقِ سماع کو من جانب اللہ جانتے تھے۔ موسیقی پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اپنے والد کی موت کے بعد میر دردؔ سجادہ نشین ہوئے۔ ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں لیکن شعروشاعری اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ تاعمر چلتا رہا۔ تصوف، موسیقی اور شاعری کی طرف ان کا فطری رجحان تھا۔ دردؔ ایک ایسے انسان تھے جنھیں قدرت نے حسنِ سیرت کے ساتھ ساتھ حسنِ صورت بھی بخشی تھی۔ مزاجاً وہ معتدل، متوازن، حلیم، بردبار اور صبر وتحمل کے پیکر تھے۔ مستقل مزاجی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ وضع دار، مہذب اور روایت پسند، درویش صفت انسان تھے۔ انسانی رشتوں کا احترام ان کے نزدیک بہت اہم تھا۔ دل آزاری کو وہ بڑا گناہ تصور کرتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت اور ریاضت میں گزرتا تھا۔ میر دردؔ کو دہلی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ جب دہلی اجڑ رہی تھی اور اہلِ کمال ایک ایک کر کے دہلی سے دوسرے مقامات کے لیے ہجرت کر رہے تھے۔ اس وقت بھی دردؔ نے دہلی چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ یہیں ۷/ جنوری ۱۷۸۵ء کو تقریباً چھیاسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

میر دردؔ کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی شخصیت، ان کا مزاج، ان کا کردار، فکر واحساس، طرزِ عمل اور طرزِ حیات اور خواہ شاعری ہو یا پھر نثر ہر ایک میں ایک توازن برقرار ہے۔ ان کی کل تصانیف کی تعداد بارہ ہے۔ جن میں اسرارالصلوٰۃ (۱۱۴۸ھ/ ۳۶-۱۷۳۵ء)، رسالہ واردات (۱۱۷۲ھ/ ۵۹-۱۷۵۸ء)، علم الکتاب (۱۱۸۱ھ/ ۶۸-۱۷۶۷ء)، نالۂ درد (۱۱۹۰ھ/ ۷۷-۱۷۷۶ء)، سوزِ دل، آہِ سرد (۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء)، شمعِ محفل (۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء)، دردِ دل (۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء)، حرفِ غنا، واقعاتِ درد، دیوانِ فارسی، اور دیوانِ اردو شامل ہیں۔ ان میں دیوانِ اردو کے علاوہ باقی ماندہ تمام تصانیف فارسی میں ہیں۔

اسرارالصلوٰۃ: میر درد کی اولین تصنیف ہے۔ یہ مختصر رسالہ میر دردؔ نے محض پندرہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے فرائضِ نماز کے سات ارکان کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اور ہر رکن کو 'سر' کا نام دیا ہے۔ اس رسالے کے اخیر میں یادگار کے طور پر دردؔ نے اپنی ایک فارسی رباعی بھی شامل کی ہے۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دردؔ نے اپنی شاعری کی شروعات فارسی سے کی تھی۔

رسالہ واردات: اس رسالے کا ذکر سب سے پہلے قائم چاند پوری کے تذکرے 'مخزن نکات' میں ملتا ہے۔ اس میں قلبی واردات ومشاہدات اور صوفیانہ تجربات کی مختلف زاویے سے تشریح پیش کی گئی ہے۔ اس میں کل ایک سو گیارہ واردات ہیں اور ہر تجربے کو 'وارد' کا نام دیا گیا ہے۔ اس رسالے کو دردؔ نے ۳۹ سال کی عمر میں تصنیف کیا تھا۔ درحقیقت یہ رسالہ فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ ہر واردات کے آغاز میں تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازیں رباعی آتی ہے۔ پھر اس کی تشریح بیان کی گئی ہے اور اخیر میں پھر ایک رباعی آتی ہے۔ اس رسالے میں شامل تمام تر رباعیوں کا بنیادی موضوع تصوف ہے۔

علم الکتاب: علم الکتاب کو رسالہ 'واردات' کی شرح بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس تصنیف

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میں شریعت وطریقت کے تمام ممکنہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں تصوف کا ایک نیا نظریہ ''طریقِ محمدی'' کے فکر وفلسفہ کو پیش کیا گیا ہے۔اس میں مصنف نے وحدت الوجوداور وحدت الشہو ددونوں کوضم کر کے ایک نئی وحدت دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ تصوف کے تعلق سے میر دردؔ کا ایک اہم اضافہ ہے۔علم الکتاب تصوف سے متعلق ایک نہایت فکرانگیز تصنیف ہے۔

دیوانِ فارسی: ایک مختصر سا دیوان ہے۔اس میں دردؔ نے تصوف اور معرفت کو پیش کیا ہے۔اگر چہ دردؔ نے فارسی میں غزلیں بھی کہی ہیں۔لیکن اس میں رباعیوں کی تعداد زیادہ ہے۔یہ رباعیاں ان کے فکر واحساس کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

دیوانِ دردؔ (اردو) : تقریباً پندرہ سواشعار پر مشتمل ہے۔اس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔رباعیاں بھی ہیں۔ لیکن غزلوں کے مقابلے ان کی تعداد کم ہے۔ان کے علاوہ چار مخمس اور ایک ترکیب بند بھی شامل ہے۔دردؔ کے اردو دیوان کے بارے میں میر حسن نے 'تذکرۂ شعرائے اردو' میں لکھا ہے کہ 'اس کا دیوان اگر چہ مختصر ہے لیکن دیوانِ حافظ کی طرح سراپا انتخاب ہے'۔دردؔ کے یہاں صوفیانہ واردات اور مذہبی فکر شاعری کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔اس کا مقصد تہذیبِ نفس اور اصلاحِ فرد ہے۔ان کی شاعری میں انسان کی عظمت اور اخلاقیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ان کے یہاں وسیع المشربی بھی ہے اور ایثار کا جذبہ بھی۔میر دردؔ کے عہد میں سیاسی اور معاشی ابتری اپنے انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔انسانی رشتے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔شکستگی اور افسردگی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔انھوں نے اپنی فکر سے، اپنی تصانیف سے اور اپنی شاعری سے رنجیدہ انسان کو تصوف کے سائبان میں پناہ دینے کی کوشش کی ہے۔اسے ایک نیا حوصلہ دیا اور زندگی جینے کا مقصد بتایا اور معاشرے کے وجودِ باطنی میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔نمونۂ کلام یہ ہے:

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دل میں ہو
دردؔ منزل ایک تھی ، ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

معلوم نہیں اس کا ارادہ ہے کدھر کا
مانندِ فلک دل متوطن ہے سفر کا

خواجہ میر دردؔ کے نزدیک شاعری کوئی ایسا کمالِ فن نہیں جس کو اپنا پیشہ بنایا جائے اور اس پر فخر کیا جائے۔شاعری ایک انسانی ہنر ضرور ہے لیکن یہ دنیا کمانے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔شاعر کے لیے لازم ہے کہ وہ شاعری مدح اور ہجو کے لیے نہ کرے۔ان کے نزدیک 'شاعری ان معارفِ تازہ کا اظہار ہے جو قلبِ شاعر پر وارد ہوتے ہیں' کلامِ موزوں میں ایک عجیب طرح کی لذت پائی جاتی ہے۔جس سے دل کی مرجھائی ہوئی کلی شگفتہ ہو اٹھتی ہے۔یہ ایک قسم کی سنجیدہ سرگرمی ہے۔اس کے وسیلے سے شاعر اپنے قلبی واردات اور باطنی تجربات کا اظہار اس طور پر کرتا ہے کہ سامعین اور قارئین کے دل ودماغ میں گھر کر جاتی ہے۔بہ الفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری میں آمد کی کیفیت لازم ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ شاعری مدح وہجو سے پاک ہو:

شیوہ نہیں اپنا ہے عبث ہرزہ سرائی　　　کچھ بات کہیں گے جو کوئی کان ملے گا

ان کے یہاں ظاہر و باطن آئینے کی طرح صاف شفاف ہیں۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ان کی شخصیت اور سیرت کو پرکھنے کے لیے ان کی شاعری کا مطالعہ ہی کافی ہے:

شعر میں میرے دیکھنا مجھ کو　　　ہے مرا آئینہ صفائے سخن

شاعر ایک نغمہ سرا کے مانند ہے جو عشق ومحبت کی کیفیات کو پُر درد انداز میں شاعری کے ساز پر گاتا ہے۔ دردؔ نے شاعری کے وسیلے سے حقیقت ومعرفت کی ترجمانی کی ہے:

پھولے گا اس زمیں میں بھی گلزارِ معرفت　　　یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

دردؔ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی انھیں کیفیات وواردات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں جنھیں وہ اپنے قارئین کے روبرو اعتماد کے ساتھ پیش کر سکیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے شاعری میں وہ تمام تجربے نہیں کیے جو میر تقی میرؔ نے کیے۔ دردؔ کے یہاں تجربوں کا ایک انتخاب ہے۔ عشق کو اردو غزل کی روح کہا جاتا ہے۔ اس کی دو نوعیتیں ہیں مجازی اور حقیقی۔ جب ہم میر دردؔ کی شاعری کو ان کی زندگی کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ان کی شاعری میں عشقِ حقیقی کا رنگ جلوہ گر ہوا اٹھتا ہے اور جب ہم دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں تو اس میں مجاز کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ دردؔ کے یہاں 'تصوف برائے شعر گفتن خوب است' کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کی شاعری اس جذبۂ عشق کا اظہار ہے جس سے وہ خود سرشار ہیں۔ ان کی شاعری میں عشقِ حقیقی کا رنگ بے حد گہرا ہے۔ درد کے یہاں صوفیانہ فکر میں جذبے کی چمک اور تجربے کی گرمی رواں دواں ہے۔ اسی میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ اردو زبان کے ایک عظیم شاعر ضرور ہیں لیکن ان میں میر تقی میرؔ اور غالبؔ کی سی آفاقیت نہیں ہے۔ دردؔ کے تصورِ عشق کے مطابق عشق ہی کے سبب اس کائنات کا نظام قائم ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو رفعت و بلندی عطا کرتا ہے۔ عشق ہی درد کا اصل درماں ہے۔ عقل بے بس ہے اور عشق کامل ہے۔ جب عشق کی حکمرانی قائم ہوتی ہے تو انسانی قدریں پروان چڑھتی ہیں:

اے عقل بے حقیقت دیکھا شعور تیرا　　　باہر نہ آ سکی تو قیدِ خودی سے اپنی
یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک وفہم یاں　　　دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

دردؔ کے یہاں عشق ہی مقصدِ حیات ہے:

اے دردؔ چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذبِ عشق　　　کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

تصوف کے تمام بنیادی تصورات دردؔ کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ یہی چیز ان کی شاعری کا امتیاز ہے۔ دردؔ کے یہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود الگ الگ نہیں ہیں بلکہ دونوں آپس میں ضم ہو گئے ہیں:

متفق آپس میں ہیں اہلِ شہود　　درد آنکھیں دیکھ باہم ایک ہیں
وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیے　　پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیے
ہووے کب وحدت میں کثرت سے خلل　　جسم و جاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں

دردؔ نے صوفیانہ تصورات اور اصطلاحات کو اپنی شاعری میں بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ یہی سب ہے کہ اس میں اثر انگیزی ہے:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے　　میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
اے دردؔ مثلِ آئینہ ڈھونڈ اس کو آپ میں　　بیرونِ در تو اپنی قدم گاہ ہی نہیں

اس طرح کے اشعار ان کی شاعری میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ دردؔ کی غزلوں کے اشعار بعض اوقات مربوط نظر نہیں آتے۔ موت انسانی فکر کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ لیکن دردؔ کے یہاں موت کا احساس زندگی کو سمجھنے اور عرفان حاصل کرنے کا شعور و آگہی بخشتا ہے:

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاو　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
نہ پوچھو کچھ ہمارے ہجر کی اور وصل کی باتیں　　چلے تھے ڈھونڈتے جس کو سو وہ ہی آپ ہو بیٹھے
گر دیکھیے تو مظہرِ آثارِ بقا ہوں　　اور سمجھیے جوں عکس مجھے محوِ فنا ہوں

دردؔ جب صوفیانہ تصورات کو اس پُر تاثیر طریقے سے بیان کرتے ہیں کہ دردؔ اور تصوف دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ یہی چیز اپنے معاصرین میں انھیں انفرادیت بخشتی ہے۔ عظمتِ انسان دردؔ کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔

باوجود یہ کہ پر و بال نہ تھے آدم کے　　پہنچا واں تک کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

دردؔ کے یہاں احساس فکر کے تابع ہے۔ دیوانِ دردؔ میں ایسے اشعار بھی اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں جن میں مجاز غالب ہے۔ ان اشعار میں جو والہانہ پن ہے اس سے عام قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ لیکن صوفیانہ اشعار میں جو تفکر و تجربہ ہے وہ عشقِ مجازی کے اشعار میں نہیں ہے۔ ان کے عشقیہ اشعار میں عاشق کی بے قراری، اضطراب، بے چینی اور اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی فطری طور پر نظر آتی ہے۔ تاہم دردؔ کا عشق میرؔ کے عشق کی طرح بے محابا نہیں ہے۔ دردؔ کے یہاں عشق میں مایوسی اور ناکامی کی جگہ لذتِ دید کا احساس پایا جاتا ہے:

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہیں　　پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن | میں جو پہنچا تو کہا خیر یہ منظور نہ تھا
صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حورِ بہشت | پر کہاں یہ شوخیاں، یہ طور، یہ محبوبیاں

دردؔ کے یہاں اضطراب، بے چینی، بے قراری، قول وقرار کی باتیں اور چھیڑ چھاڑ سب کچھ ہے لیکن ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے دردؔ ایک باہوش عاشق ہیں۔ ان کے اشعار میں مجازی رنگ کے پسِ پردہ حقیقی رنگ بھی جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری کا عاشق ناکام، نامراد، شکست خوردہ اور آوارہ نہیں ہے۔ اس کے عشق میں محبوب برابر کا شریک ہے۔ اس کے کردار میں ہرجائی پن نہیں ہے۔ دردؔ کی شاعری کے عاشق اور معشوق دونوں باہوش ہیں۔ ان کا اصل کارنامہ تصوف کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی روایت کو جنم دیا جو اردو شاعری میں ایک نئی چیز تھی۔ اس اندازِ فکر نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ سادگی، زبان و بیان میں دلکشی ان کے کلام میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔

5.3.9 محمد قیام الدین قائمؔ چاند پوری (۱۷۲۲ تا ۹۴-۱۷۹۳)

محمد قیام الدین نام اور تخلص قائمؔ تھا۔ ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں ضلع بجنور کے قصبہ چاند پور میں پیدا ہوئے۔ قائم عہدِ میرؔ کے ایک اہم شاعر تھے اور تذکرہ نویس بھی۔ بچپن ہی میں اپنے بڑے بھائی کے پاس دہلی آ گئے۔ دہلی ہی میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہیں ان کا ذوقِ شاعری پروان چڑھا۔ قائم شاہی توپ خانے میں سرکاری ملازم تھے۔ ان کی ملاقات میر سوزؔ سے یہیں ہوئی۔ قائمؔ اور میر سوزؔ میں گہری دوستی تھی۔ ۱۷۵۳ء میں عماد الملک نے جب احمد شاہ کو معزول کر دیا تو قائم کی ملازمت بھی جاتی رہی۔ اسی زمانے میں قائم نے اپنا تذکرہ 'جریدہ احوال سخنورانِ متقدم وحال' کے نام سے تحریر کیا جو بعد میں 'مخزنِ نکات' کے نام سے مشہور ہوا۔ قائم دہلی میں ۱۷۵۷ء تک مقیم رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن چاند پور واپس چلے گئے۔ تلاشِ معاش میں آنولہ، امروہہ، سنبھل، مراد آباد اور بسولی کا سفر کیا۔ بالآخر ٹانڈا پہنچ کر نواب محمد یار خاں امیرؔ کے ملازم ہو گئے۔ ۱۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ جب مرہٹوں کے ہاتھوں ٹانڈا تاراج ہوا تو ایک بار پھر قائمؔ بے یار و مددگار ہو گئے۔ تلاشِ معاش میں انھیں لکھنؤ کا دو بار سفر کرنا پڑا۔ جب وہ دوسری بار لکھنؤ پہنچے تو شہزادہ سلیمان شکوہ کا دربار آراستہ تھا۔ قائمؔ نے شہزادے کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا۔ بالآخر جائداد اور وظیفہ کی بحالی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ چاند پور ہوتے ہوئے رام پور پہنچے۔ یہیں ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء میں وفات پائی۔ اور نواب محمد یار خاں کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

قائم نے پہلے دردؔ اور پھر سوداؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ مزاجاً وہ سوداؔ کے زیادہ قریب تھے۔ قائم کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوئے جس میں آسمانِ ادب پر میرؔ و سوداؔ جیسے عظیم المرتبت شعرا آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے تھے۔ ان کے آگے اس عہد کے دوسرے شعرا ٹمٹماتے تاروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

خواجہ میر دردؔ اگر فقر و تصوف کو اپنا موضوع نہ بناتے تو ان کی انفرادیت بھی قائم نہ رہ پاتی۔ قائم نے ایک ضخیم کلیات یادگار چھوڑا ہے۔ انھوں نے تمام اہم اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ بعض اوقات ان کے کلام میں جا بجا ہجو اور فحش اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں میرؔ و سوداؔ کا سا انداز جھلکتا ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند   کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ   کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

5.3.10 محمد میر سوزؔ (۱۷۲۱ء تا ۹۹-۱۷۹۸ء)

محمد میر نام تھا۔ پہلے میرؔ تخلص کرتے تھے لیکن جب میر تقی میرؔ کی شہرت کافی بڑھ گئی تو انھوں نے اپنا تخلص سوزؔ رکھ لیا۔ ''کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ موئے ہزار حیف---- اب جو کہے ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو'، سوزؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہیں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ وہ ایک بلند پایہ ہفت قلم خطاط بھی تھے۔ نستعلیق اور خطِ شفیعا میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ تیر اندازی اور گھوڑ سواری میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ ظریف طبع اور خوش گفتار تھے۔ مزاج میں شگفتگی تھی۔ آدابِ صحبتِ ملوک میں بے مثل تھے۔ موسیقی سے بھی شغف رکھتے تھے۔ شاہی توپ خانے میں ملازم تھے۔ احمد شاہ کی معزولی کے بعد ۱۷۵۴ء میں ملازمت جاتی رہی۔ تلاشِ روزگار میں فرخ آباد پہنچے اور نواب مہربان خاں رندؔ کے ملازم ہو گئے۔ یہاں ایک عرصے تک سوداؔ کا ساتھ رہا۔ سوزؔ سوداؔ سے مشورۂ سخن لیا کرتے تھے۔ ۱۷۷۱ء میں نواب احمد خاں کی وفات کے بعد نواب مہربان خاں رندؔ کی دیوانی بھی جاتی رہی۔ اب تلاشِ معاش میں سوزؔ فرخ آباد سے فیض آباد آ گئے۔ اس وقت نواب شجاع الدولہ فرمانروائے اودھ تھے۔ لیکن سوز کی ان تک رسائی نہ ہو سکی۔ جب نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے تو کچھ عرصے بعد سوزؔ آصف الدولہ سے وابستہ ہو کر لکھنؤ آ گئے۔ ۱۷۹۸ء میں سوزؔ نے وفات پائی۔ وہ ایک شریف النفس انسان تھے۔ مدح و قدح سے اپنی شاعری کو پاک رکھا۔ حتیٰ کہ ان نوابین اور امرا کی بھی مدح گوئی نہیں کی جن سے وہ وابستہ رہے۔

ان کے کلام میں گہرائی نہیں لیکن زبان میں لطافت ضرور ہے۔ شعر پڑھنے کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کرتے جاتے تھے۔ آگے چل کر لکھنؤ میں جس رنگِ شاعری نے مقبولیت حاصل کی اس کے اولین نمونے میر سوزؔ کے یہاں موجود ہیں۔ سوزؔ لکھنوی رنگ کے بانی اور پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سوزؔ کی شاعری میں اردو پن نمایاں ہے۔ ان کے یہاں فارسیت بہت کم ہے۔ سوزؔ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو مانجھا اور اسے ایک ایسی صورت بخشی کہ آئندہ نسلوں نے اسے اپنے تخلیقی جوہر کی کسوٹی بنا لی۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

اہلِ ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا   آہ یا رب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر — سوزؔ کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں
بھلا کون لُچا ہے انصاف کیجے — بھلے آدمی ہو زباں ٹک سنبھالو
وہ صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں — اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

5.3.11 خواجہ محمد میر اثرؔ دہلوی (۱۷۳۵ء تا ۱۷۹۴ء)

خواجہ محمد میر نام اور اثرؔ تخلص تھا۔ ۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی بھی تھے اور ان کے مرید بھی تھے۔ میر دردؔ کے زیرِ سایہ ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ خواجہ احمد خاں سے علومِ ضروریہ حاصل کیا۔ تصوف، موسیقی اور تاریخ گوئی پر انھیں عبور حاصل تھا۔ علم، ریاضی میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ میر دردؔ کی وفات کے بعد میر اثرؔ ہی ان کے خلیفہ و جانشین مقرر ہوئے۔ میر اثرؔ ابھی پندرہ سال ہی کے تھے کہ نومبر ۱۷۴۹ء کو ان کی شادی ہوگئی۔ تقریباً ۶۱ سال کی عمر میں صفر ۱۲۰۹ھ/ اگست ۱۷۹۴ء میں ان کا انتقال دہلی ہی میں ہوا۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ دردؔ نے میر اثرؔ کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر اثرؔ جو بن سکتے تھے وہ نہ بن سکے۔

میر اثرؔ نے ایک مختصر سا دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ جس میں دو مثنویاں ''خواب وخیال'' اور ''بیان واقع'' شامل ہیں۔ ''بیان واقع'' فارسی زبان میں لکھی گئی ایک مثنوی ہے۔ اس میں اثرؔ نے اپنا نسب نامہ اور اپنے نانا سید محمد قادری کے واقعۂ شہادت کو بیان کیا ہے۔ مثنوی 'خواب وخیال' نہ صرف میر اثرؔ کی شاہکار ہے بلکہ تاریخِ ادب اردو میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہے۔ درحقیقت یہ مثنوی میر اثرؔ کی آپ بیتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے مجازی عشق کو بڑے بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اثرؔ اپنی اس داستانِ عشق کو عام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مثنوی کو دوستوں نے سنا اور اپنے بیاضوں میں درج کر لیے۔ اس طرح یہ قصہ عام ہوگیا۔ بالآخر رسوائی کے خوف سے اثرؔ نے اس کہانی میں ترمیم و اضافے کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عشقِ حقیقی کا یہ قصہ مجاز کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ بلاشک اثرؔ نے اس مثنوی میں ہجر و وصل کی کیفیات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ مجاز اور حقیقت دونوں ایک دوسرے میں پیوستہ نظر آتے ہیں۔ عشق اثرؔ کی شخصیت اور سیرت کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایک مثنوی نگار کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں پر بھی مثنوی کا رنگ چڑھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میر اثرؔ کی غزلیں کیا ہیں؟ یہ 'اظہارِ رنج' کی شاعری ہے۔ ان کی مثنوی 'خواب وخیال' اور ان کی غزلوں کا بغور مطالعہ کرنے پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ غزلیں 'خواب وخیال' کی پرتو ہیں۔ ان غزلوں میں انتظار کی کیفیت، محبوب کی یادیں، اس کی بے وفائی، ہجرِ یار کی تڑپ، ماضی کی یادیں اور معاملاتِ عشق کا اظہار بار بار ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

اب ملاقات بھی ہوئی تو کیا　　سب مکافات بھی ہوئی تو کیا
اب تو بالفرض تو گر آن ملے　　ہوویں شکوے نہ میری جان گلے
اب نہ اپنی خبر نہ دل کی خبر　　ہو گیا ہے زوال عین و اثر
میں رہا ہوں کچھ خبر ہووے　　دل رہا ہو تو اب اثر ہووے

(مثنوی 'خواب وخیال')

ترے آنے کا احتمال رہا　　مرتے مرتے یہی خیال رہا
پھر کے دیکھا نہ اس طرف ان نے　　آہ ہر چند میں پکار رہا

5.3.12 میر حسنؔ دہلوی (۱۷۲۷ء تا ۱۷۸۶ء)

میر غلام حسن نام اور تخلص حسنؔ تھا۔ ۱۷۲۷ء میں دہلی کے محلّہ سید واڑا میں پیدا ہوئے۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اپنے دور کے مشہور و معروف مرثیہ گو میر غلام حسین ضاحکؔ کے بیٹے تھے۔ پانچ پشتوں سے ان کا خاندان دہلی میں آباد تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ میر امام موسوی شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے دہلی آئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ انھوں نے بادشاہِ وقت سے قربت حاصل کی اور سہ ہزاری منصب پر فائز ہو گئے۔ میر حسنؔ کی تعلیم و تربیت ان کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ ہوش سنبھالا تو ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی ہونے کے باعث میر حسنؔ کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ لڑکپن ہی سے فارسی میں شعر کہنے لگے۔ جب دہلی برباد ہوئی تو اپنے والد کے ساتھ دہلی سے لکھنؤ کے لیے ہجرت کی۔ لکھنؤ پسند نہیں آیا تو پھر کچھ عرصے کے لیے فیض آباد چلے گئے لیکن جلد ہی فیض آباد سے لکھنؤ واپس آ گئے اور لکھنؤ ہی کو مستقل طور پر اپنا مستقر بنا لیا۔ میر حسنؔ فیض آباد میں میر حبیب اللہ کے مشورے سے ریختہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے فارسی میں شعر گوئی ترک کر دی۔ وہ پہلے فیض آباد میں میر ضیاء الدین حسین ضیاؔ سے مشورۂ سخن لیتے تھے:

گفتگو اپنی برابر کب ضیاؔ سے ہو سکے　　فرق ہوتا ہے بہت شاگرد اور استاد میں

بعد میں میر ضیاؔ فیض آباد سے عظیم آباد منتقل ہو کر راجہ کلیان سنگھ عاشقؔ سے وابستہ ہو گئے۔ میر حسنؔ نے بھی لکھنؤ کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا تھا۔ یہاں اب وہ مرزا محمد رفیع سوداؔ سے مشورۂ سخن لینے لگے:

گیا تھا بھول سب کچھ میں تو بنگلے کی جدائی میں　　غزل یہ مجھ سے کہوائی حسنؔ سوداؔ نے کہہ کہہ کر
حسنؔ سوداؔ زباں اپنی میں خلاقِ معانی تھا　　کرے اب کیا سخن کی کوئی خلاقی تکلف میں

میر حسنؔ تقریباً تمام عمر سالار جنگ سے وابستہ رہ کر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہم نشین رہے۔ لیکن سرکار سے اتنا کم وظیفہ ملتا تھا کہ وہ گزر اوقات کے لیے ناکافی تھا۔ لہٰذا زندگی بھر تنگدستی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بہت

کوشش کی کہ نواب آصف الدولہ کی نگاہِ التفات ان پر پڑے مگر قسمت نے ساتھ نہیں دی۔ اپنی شاہکار مثنوی 'سحر البیان' لکھ کر ایک قصیدے کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کیا لیکن ایک دوشالے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میر حسنؔ کی پوری زندگی فاقہ مستی میں بسر ہوئی۔ بالآخر ۱۲۰۱ھ/۲۴ر اکتوبر ۱۷۸۶ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور محلّہ مفتی گنج میں قاسم علی خاں کے باغ کے پسِ پشت دفن ہوئے۔ مصحفیؔ نے ایک قطعۂ تاریخِ وفات کہا اور 'شاعرِ شیریں زباں' سے تاریخِ وفات نکالی۔

میر حسن کے چار بیٹے تھے۔ میر مستحسن خلیق، میر محسن محسن، میر احسن خلق اور سید احسن مخلوق۔ مجموعی طور پر میر حسن کی دو تصانیف ہیں۔ اول 'کلیاتِ میر حسن' اور دوسری تصنیف 'تذکرۂ شعرائے اردو' ہے۔ میر حسن نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ گھر میں آگ لگ جانے کے سبب ان کا سارا کلام جل گیا تھا۔ جس کو دوبارہ انھوں نے اپنے دوستوں کی مدد سے جمع کیا۔ موجودہ کلیات میں تقریباً نو ہزار اشعار شامل ہیں۔ اس میں بارہ مثنویاں، سات قصیدے، ایک ترکیب بند، بارہ مخمس، ایک مسدس، ۱۴۵ رباعیات، رباعیات در تعریفِ اہلِ حرفہ، قطعات، ہجویات، ۲۷ مثلث، اشعار در تعریف کبڈی اور در تعریف طوئف وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ کلیات کے تقریباً نصف سے کچھ کم حصے پر مشتمل غزلیں ہیں۔

ان کے قصیدوں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ جیسا نہ تو زورِ بیان ہے، نہ شکوہِ الفاظ اور نہ ہی آہنگ، نہ مضمون آفرینی ہے اور نہ ہی مبالغہ جن سے میر حسن کے قصائد کو انفرادیت اور بلندی عطا ہو۔ درحقیقت میر حسنؔ کے قصائد مثنوی سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جذبات واحساسات، اسلوب، فکر، خیال، لہجہ اور آہنگ میں کوئی ارتقا نہیں بلکہ یکسانیت ہے۔ تاہم زبان کی صفائی، لہجے کی متانت، محاورہ وروزمرہ کی چستی سب کچھ ہے لیکن اس میں وہ انفرادیت نہیں جس سے اردو غزل میں میر حسنؔ کو کوئی منفرد مقام حاصل ہو۔ جس صنفِ سخن نے میر حسن کو بقائے دوام بخشا وہ مثنوی ہے۔ میر حسنؔ نے چھوٹی بڑی بارہ مثنویاں لکھیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ نقلِ کلاونت	۲۔ نقلِ زنِ فاحشہ
۳۔ ہجوِ قصائی	۴۔ نقلِ قصائی
۵۔ مثنوی شادی آصف الدولہ (۱۱۸۳ھ/ ۶۹-۱۷۷۰ء)	۶۔ مثنوی رموز العارفین (۱۱۸۸ھ/ ۷۵-۱۷۷۴ء)
۷۔ مثنوی ہجوِ حویلی (۹۰-۱۱۸۹ھ/ ۷۶-۱۷۷۵ء)	۸۔ مثنوی گلزارِ ارم (۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۸ء)
۹۔ مثنوی در تہنیت عید (۱۱۹۹ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء)	۱۰۔ مثنوی در وصفِ قصرِ جواہر (۱۱۹۹ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء)
۱۱۔ مثنوی درخوانِ نعمت (۱۱۹۹ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء)	۱۲۔ مثنوی سحر البیان (۱۱۹۹ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء)

مثنوی 'نقلِ قصائی' باضابطہ کلیاتِ میر حسن میں شامل نہیں ہے۔ یہ مثنوی شاہ کمال کے تذکرے 'مجمع الانتخاب' کی زینت ہے۔ باقی ماندہ تمام مثنویاں کلیاتِ میر حسن میں شامل ہیں۔ مثنوی 'گلزارِ ارم' ایک سوانحی مثنوی ہے۔ اس میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ سچے واقعات پر مبنی ہیں۔ میر حسن کی قوتِ مشاہدہ نے اس مثنوی میں اس دور کی

تہذیب اور مزاج کو محفوظ کر لیا ہے۔ ان تمام مثنویوں میں 'سحر البیان' جو نہ صرف میر حسنؔ کی شاہکار ہے بلکہ اردو مثنویوں میں گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ان کی آخری عمر کی تخلیق ہے۔ ۲۱۷۹ ابیات پر مشتمل اس مثنوی میں وہ تمام خصوصیات یکجا ہیں جو ایک بہترین مثنوی میں پائی جانی چاہیے۔ میر حسنؔ کی ایک اہم تصنیف 'تذکرہ شعرائے اردو' ہے۔ اس میں کل ۳۰۴ شعرا کا ذکر اور ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ میر حسنؔ نے اس کی شروعات ۱۱۸۴ھ/ ۷۱-۱۷۷۰ء کے لگ بھگ کی تھی۔ اس میں تمام تر ترمیم و تنسیخ کے بعد یہ تذکرہ ۱۷۷۸ء میں اپنی موجودہ صورت میں مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ اپنے زمانے کے چلن کے مطابق فارسی میں لکھا گیا ہے۔

5.3.13 ماحصل

عزیز طلبا! اس اکائی میں میرؔ کے اہم معاصرین کی حیات و خدمات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اس اکائی میں کل بارہ شعرا کی حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر مختصراً بحث کی گئی ہے۔ میرؔ کا عہد ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی تاریخ کا ایک پُر آشوب دور تھا۔ اس دور میں دہلی متعدد بار تاخت و تاراج ہوئی۔ لیکن وہیں دوسری جانب اسی دور میں دہلی علما، مشائخ، شعرا اور ادبا کا گہوارہ بنی رہی۔ اس دور کو اردو ادب کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد میرؔ، سوداؔ، سوزؔ، قائمؔ، میر حسنؔ وغیرہ نے تلاشِ معاش کے سلسلے میں دہلی سے نکل کر لکھنؤ اور دیگر مقامات کا سفر کیا۔ لیکن خواجہ میر دردؔ ایک درویش صفت انسان تھے، انھیں دہلی سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ لہٰذا انتہائی مشکل حالات میں بھی دردؔ نے دلی چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ میرؔ نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ اردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ میرؔ کے سامنے اس عہد کے دوسرے شعرا کے چراغ کی لَو کافی مدھم دکھائی دیتی ہے۔ اردو غزل گویوں میں میرؔ ایک بلند ترین مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی عظمت کو سب نے تسلیم کیا۔ وہ شہنشاہِ غزل ہیں۔ سوداؔ اردو قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے بڑی زندہ دلی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ دردؔ صوفیانہ شاعری میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ سوزؔ کو میرؔ نے آدھا شاعر تسلیم کیا ہے۔ سوزؔ لکھنوی رنگ کے بانی اور پیش رو تسلیم کیے جاتے ہیں۔ قائمؔ چاندپوری کا المیہ یہ ہے میرؔ سوداؔ کے سامنے ان کے چراغ کی لے بہت مدھم ہے۔ قائمؔ درحقیقت اپنے تذکرے 'مخزنِ نکات' کی وجہ سے اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ میر حسنؔ میرؔ کی طرح زندگی بھر فاقہ مست رہے لیکن بحیثیت مثنوی نگار انھیں شہرتِ دوام حاصل ہے۔ انعام اللہ خاں یقینؔ کو ان کے عہدِ شباب ہی میں قتل کر دیا گیا لیکن وہ اپنے عہد کے نئی نسل کے شعرا کے رہنما ہیں۔ میرؔ نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ اردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر ہیں۔

5.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کے نمائندہ معاصرین کے متعلق جانکاری حاصل کی۔

- میرؔ کے نمائندہ معاصرین کے نمونۂ کلام سے واقفیت حاصل کی۔
- معاصرین میرؔ کے شعری رجحانات اور ترجیحات کا علم حاصل کیا۔
- معاصرین میرؔ کے شعری کارموں سے آگہی حاصل کی۔
- معاصرین میرؔ کے ادبی مقام و مرتبہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔

5.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کی حیات پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

۲۔ خواجہ میر دردؔ کی تصنیفات تحریر کیجیے۔

۳۔ میر سوزؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیات سپردِ قلم کیجیے۔

۴۔ میر حسنؔ کے ادبی سرمایے کی مختصراً وضاحت کیجیے۔

۵۔ اشرف علی خاں فغاںؔ کی حیات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

5.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مرزا محمد رفیع نام اور سوداؔ تخلص تھا۔ بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک سوداؔ کے آبا و اجداد کا تعلق کابل سے تھا۔ لیکن بھگوان داس ہندی کے تذکرے ''سفینۂ ہندی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے سوداؔ کے بزرگوں کا وطن بخارا ہی بتایا ہے۔ اگرچہ سوداؔ کا آبائی پیشہ سپہ گیری تھا لیکن ان کے والد مرزا شفیع نے سپہ گیری کے پیشے کو نہ اپنا کر تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کا شمار دہلی کے بڑے تاجروں میں ہوا کرتا تھا۔ والد کی وفات کے بعد سودا کو جو ترکہ ملا اسے انھوں نے دوست نوازی میں خرچ کر دیا۔ سودا دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ عہدِ وسطی کی دہلی میں جہاں کابلی دروازہ ہوا کرتا تھا، اس کے گرد و نواح میں ایک گنجان آبادی تھی۔ سوداؔ کا آبائی مکان وہیں ہوا کرتا تھا۔ اب نہ وہ کابلی دروازہ ہے اور نہ اس کے ارد گرد جو مکانات تھے ان کی باقیات۔ سودا کی تعلیم و تربیت روایتی انداز میں ہوئی۔ انھوں نے فارسی زبان و ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ بڑی حد تک عربی زبان و ادب سے واقفیت رکھتے تھے۔ شروع میں سوداؔ نے گزر اوقات کے لیے فوج میں نوکری کر لی۔ لیکن ان کو سپہ گیری کا پیشہ راس نہیں آیا۔ انھوں نے اسے ترک کر کے ملازمت و مصاحبت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ خاندانی اعزاز اور اپنی قابلیت کی بنیاد پر انھوں نے بادشاہوں اور امراء کی قربت حاصل کر لی۔ سوداؔ کو کتے پالنے اور موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ سوداؔ مختلف سرکاروں اور درباروں سے وابستہ رہے۔ پہلے انھوں نے محمد شاہ کے خواجہ سرا بسنت علی خاں کی

مصاحبت اختیار کی، بعد ازیں سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر کی قربت اختیار کی، پھر نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔۱۷۶۲ء میں سوداؔ عماد الملک کے ساتھ دہلی سے فرخ آباد پہنچے اور وہاں انھوں نے مہربان خاں رند کی مصاحبت اختیار کر لی۔۱۷۶۹ء تک سوداؔ فرخ آباد میں مقیم رہے۔ اس کے بعد انھوں نے فیض آباد کی راہ لی اور نواب شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ اودھ کے فرماں روا ہوئے۔ آصف الدولہ نے چھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر بخشی۔ جب اودھ کا پائے تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا تو سوداؔ بھی نواب آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ یہیں آموں کی فصل میں آم کھانے سے بیمار پڑے اور ۱۷/ جون ۱۷۸۱ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور آغا امام باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔

۲۔ میر دردؔ کی کل تصانیف کی تعداد بارہ ہے۔ جن میں اسرار الصلوٰۃ (۱۱۴۸ھ/ ۳۶-۱۷۳۵ء)، رسالہ واردات (۱۱۷۲ھ/ ۵۹-۱۷۵۸ء)، علم الکتاب (۱۱۸۱ھ/ ۶۸-۱۷۶۷ء)، نالۂ درد (۱۱۹۰ھ/ ۷۷-۱۷۷۶ء)، سوزِ دل، آہِ سرد (۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء)، شمعِ محفل (۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء)، دردِ دل (۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء)، حرفِ غنا، واقعاتِ درد، دیوانِ فارسی، اور دیوانِ اردو شامل ہیں۔ ان میں دیوانِ اردو کے علاوہ باقی ماندہ تمام تصانیف فارسی میں ہیں۔

۳۔ محمد میر سوزؔ کے کلام میں گہرائی نہیں لیکن زبان میں لطافت ضرور ہے۔ شعر پڑھنے کے ساتھ ساتھ ادا کاری بھی کرتے جاتے تھے۔ لکھنؤ میں جس رنگِ شاعری نے مقبولیت حاصل کی اس کے اولین نمونے میر سوزؔ کے یہاں موجود ہیں۔ سوزؔ لکھنوی رنگ کے بانی اور پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سوزؔ کی شاعری میں اردو پن نمایاں ہے۔ ان کے یہاں فارسیت بہت کم ہے۔ سوزؔ کے کلام کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو صیقل اور اسے ایک ایسی صورت بخشی کہ آئندہ نسلوں نے اسے اپنے تخلیقی جوہر کی کسوٹی بنالی۔

۴۔ مجموعی طور پر میر حسن کی دو تصانیف ہیں۔ اول 'کلیاتِ میر حسن' اور دوسری تصنیف 'تذکرۂ شعرائے اردو' ہے۔ میر حسن نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ گھر میں آگ لگ جانے کے سبب ان کا سارا کلام جل گیا تھا۔ جس کو دوبارہ انھوں نے اپنے دوستوں کی مدد سے جمع کیا۔ موجودہ کلیات میں تقریباً نو ہزار اشعار شامل ہیں۔ اس میں بارہ مثنویاں، سات قصیدے، ایک ترکیب بند، بارہ مخمس، ایک مسدس، ۱۴۵ رباعیات، رباعیات در تعریفِ اہلِ حرفہ، قطعات، ہجویات، ۲۷۷ مثلث، اشعار در تعریف کبڈی اور در تعریف طوئف وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ کلیات کے تقریباً نصف سے کچھ کم حصے پر مشتمل غزلیں ہیں۔

۵۔ اشرف علی خاں فغاں ''ظریف الملک کوکہ خاں بہادر مصاحب الدولہ یک تاز جنگ'' عہدِ میر کے ایک قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ اشرف علی خاں نام اور فغاںؔ تخلص تھا۔ ۱۱۶۱ھ/ ۴۸-۱۷۴۷ء میں جب احمد شاہ تخت نشین ہوا تو انھیں ''پنج ہزاری منصب'' اور ''کوکہ خاں'' کا خطاب عطا کیا۔ فغاںؔ کی والدہ نے محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کو دودھ پلایا تھا۔ اس اعتبار سے فغاں بادشاہ احمد شاہ کے رضاعی بھائی تھے۔ اس طرح مغلیہ دربار سے فغاں کی بڑی گہری وابستگی تھی۔ خوش طبعی اور ظرافت میں ان کا کوئی مدِ مقابل نہیں تھا۔ اگر چہ ان کی تاریخِ ولادت کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا محال ہے لیکن جمیل جالبی نے ان کی تاریخِ پیدائش ۱۱۳۸ھ/ ۲۶-۱۷۲۵ء کے آس پاس متعین کی ہے۔ جب عماد الملک نے ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو معزول کر کے عالمگیر ثانی کو تخت پر بیٹھا دیا تو فغاں بھی اپنی جان بچا کر مرشد آباد پہنچے۔ وہاں ان کے چچا ایرج خاں نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ دل برداشتہ ہو کر فیض آباد آئے۔ یہاں وہ نواب شجاع الدولہ کی دربار سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن شجاع الدولہ نے ان کے ساتھ اچھا برتاو نہیں کیا۔ اب فغاںؔ فیض آباد سے عظیم آباد پہنچے۔ وہاں راجہ شتاب رائے نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ راجہ صاحب کی سفارش پر شاہ عالم بادشاہ نے فغاں کو ''ظریف الملک'' کا خطاب اور دو تین گاؤں جاگیر میں دیے۔ یہیں عظیم آباد میں ۱۱۸۶ھ/۷۳-۱۷۷۲ء میں فغاںؔ کا انتقال ہو گیا۔ وہ عظیم آباد کے محلّہ دھول پورہ، شیر شاہ کی مسجد کے قریب آغا حسینا کے چوراہے سے متصل باون برج کے امام باڑے کے صحن میں دفن ہوئے۔

5.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
معاصرین	:	معاصر کی جمع، ہم عصر، ہم زمانہ لوگ
مصاحبت	:	ہم نشینی، ساتھ رہنا، ساتھ اٹھنا بیٹھنا
مشاہرہ	:	ماہوار تنخواہ
خلعت	:	وہ پوشاک جو بادشاہ یا امرا کی جانب سے بطورِ عزت افزائی ملے
فرماں روا	:	حکمراں، حاکم، بادشاہ
کماحقہ	:	بہ خوبی، جیسا اس کا حق ہے
یار باش	:	ملنسار، زندہ دل
وضع دار	:	اپنے طور طریقے پر قائم رہنے والا

ظریف الطبع : جس کے مزاج میں ظرافت کا مادہ زیادہ ہو

ہجوگوئی : شاعری کی ایک صنف جس میں کسی کی برائی کی جائے

مضمون آفرینی : ذہن سے نئی بات نکالنا

مسدس : ایسی نظم جس کا ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہو

محسنین : محسن کی جمع، احسان کرنے والا

خواجہ سرا : زنان خانے میں کام کرنے والا مخنث

معرکہ آرائی : جنگ کے لیے ایک دوسرے کے مقابل ہونا

نامساعد : ناسازگار

دوآتشہ : وہ عرق یا شراب جو دو دفعہ آگ پر رکھ کر کشید کی جائے

معیت : ساتھ، ہمراہی

کحل : سُرمہ

عسرت : تنگی، مفلسی

ساقی نامہ : وہ نظم جس میں ساقی کو مخاطب کر کے شراب کا ذکر کیا جاتا ہے

ترجیع بند : اصطلاح میں ترجیع بند ایک ایسی نظم ہے جس کے ہر بند کا آخری شعر یا مصرع من وعن دہرایا جاتا ہے

ترکیب بند : جو نظم کسی خاص ترکیب سے متعدد بندوں پر مشتمل ہو ترکیب بند کہلاتی ہے

فردیات : فرد کی جمع، متفرقات، مفرد اشعار

معرفت : علمِ الٰہی، پہچان، ادراک

سلوک : تصوف کی اصطلاح میں حق تعالیٰ کا تقرب چاہنا، تلاشِ حق

ایما : اشارہ

سماع : راگ یا گانا سننا، رقص وسرود

حلیم : بردبار، نرم مزاج

تصوف : علمِ معرفت، دل سے خواہشات کو دور کر کے خدا کی طرف دھیان لگانا، تزکیۂ نفس کا طریقہ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

وحدت الوجود : تمام موجودات کوخدائے تعالیٰ ہی کا ایک وجود ماننااور ماسوا کے وجودکو محض اعتباری سمجھنا

5.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ تاریخِ ادب اردو (اٹھارویں صدی۔ جلد دوم)	:	جمیل جالبی
۲۔ مختصر تاریخِ ادب اردو	:	اعجاز حسین
۳۔ تاریخِ ادب اردو	:	رام بابو سکسینہ
۴۔ دہلی کا دبستانِ شاعری	:	نورالحسن ہاشمی
۵۔ میر اور سودا کا دور	:	ڈاکٹر ثناء الحق

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY